شناسائے ازل



نلڈ کلر اس پیٹی

حصہ اول

LIVES OF DESTINY

★

D. C. PEATTIE

ترجمہ

حبیب اللہ اوج

۲ از شاہین کتب

قیمت
ایک روپیہ

شناسائے منزل

مصنف :- ڈونلڈ کلراس بیٹی

ترجمہ :- محمد حبیب اللہ اوج

حصہ اول

یونائیٹڈ بک ڈپو لمیٹڈ، لاہور

ناشر

یونائیٹڈ بک ڈپو

۶۰ - دی مال، لاہور

طباعت :— نقوش پریس

کتابت :— نذیر ہاشمی،

زیبائش :— ریزی

اشاعت اول :— ۲۵ ہزار

جنوری ۱۹۶۰ء

باہتمام

منیجر

جنرل پبلسٹی سروس

ترتیب

تعارف

ایک بڑے آدمی کا قول ہے "بڑے آدمیوں کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم بھی اپنی زندگی انہی کی زندگی کے سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں"۔ ایک اور مفکر نے اسی خیال کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے "اس دنیا میں انسان نے بعض اونچے مقاصد کے لئے جتنے لازوال اور بے مثال کام کئے ہیں۔ ان کی تاریخ دراصل اُن بڑے آدمیوں کی تاریخ ہے جنہوں نے یہ عظیم کارنامے انجام دیئے"۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے آدمی عہد آفریں ہوتے ہیں، اور جب تاریخ تشکیل پاتی ہے تو اس کی آغوش ان عظیم ہستیوں کے حسنِ سیرت اور رعنائی کردار کے لئے کشادہ ہوتی ہے۔ قرب زماں کے سبب اس دور کے لوگ اس عظیم شخصیّت کی قدر و قیمت نہیں پہچان پاتے اور عام طور پر یہ ہستیاں قدر ناشناسی کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن ان کی موت کے سالہا سال بعد زمانہ انہیں پہچانتا ہے اور پھر تاریخ میں انہیں وہ مقام عطا کرتا ہے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

"شناسائے منزل" ایسے ہی چوبیس بڑے آدمیوں کی زندگی کا مرقع ہے جن پر ع

مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک عام انسانوں کے مقابلے میں دیو قامت تھا۔ قدرت نے ان شخصیتوں کو وہ دل و دماغ عطا کیا جن سے آج بھی لاکھوں کروڑوں ذہن منوّر ہوتے ہیں اور درخشاں ہوتے رہیں گے۔ یہ چوبیس بڑے آدمی دنیا کے ہر ملک اور ہر

خطّے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت کے باعث اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں گیارہ شخصیّتوں کی سوانح درج ہیں اور دوسرا حصّہ تیرہ شخصیّتوں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ یہ مختصر خاکے ایک شہرہ آفاق صحافی ڈونلڈ کلراس پیٹی کے قلم سے ہیں۔ پیٹی نے یہ خاکے "ریڈرز ڈائجسٹ" کے لئے لکھے تھے۔ آپ کا اسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان منفرد ہے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ ان خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر خاکے میں اس شخصیّت کی انفرادیت جھلکتی ہے جس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ پیٹی کا انداز ڈرامائی ہے اور انہوں نے بڑی چابکدستی سے ان شخصیّتوں کی عکاسی کی ہے جنہیں اس کا احساس تھا کہ زندگی تبسّمِ شرر کی مانند بڑی مختصر ہے لیکن ان چار دنوں میں بہت سے مسائل حل کرتے ہیں۔ ان سوانح کو پڑھتے وقت قاری ہر شخصیت کے ساتھ ساتھ اٹھتا بیٹھتا باتیں کرتا اور اس کی ہر مصروفیت میں شرکت کرتا ہوا محسوس کرتا ہے آخر جب خاکہ ختم ہوتا ہے تو قاری اس ہستی کی عظمت کے بارے میں بھرپور اور عقیدت مندانہ تاثرات قبول کرتا ہے۔ یہ ڈونلڈ کلراس پیٹی کی تحریر کا سحر ہے۔

چند صفحات میں کسی بڑے آدمی کی زندگی کی داستان قلمبند کرنا اور سیرت کے متنوع پہلوؤں کو اس خوبی سے سمونا کہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ قاری کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے فن کارانہ مہارت کے سوا ممکن نہیں اور ڈونلڈ کلراس پیٹی نے اسی کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے:



بنجامن فرینکلن

ہر فن مولا

یہ ۱۷۳۲ء کے اوائل کی بات ہے اس سال جب امریکی عوام نے اپنی پسندیدہ جنتری کھولی تو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ اس جنتری میں حسب معمول موسمی پیشین گوئیوں اور جڑی بوٹیوں کے نسخوں کے ساتھ ساتھ ایک نیا مکین بھی امریکی گھروں میں آگیا ہے۔ اس کا نام تو غریب رچرڈ تھا لیکن حقیقتاً وہ پیسوں کی حد تک غریب تھا۔ ورنہ وہ بذلہ سنجی، خوش طبعی یا خوش کلامی کی دولت سے مالا مال تھا۔ اور اس کی بعض کہاوتیں آج کی طرح اس وقت بھی تبسّم آفریں تھیں مثلاً "دکانوں کو بار بار بدلنا گویا کاروبار میں آگ لگانا ہے"۔ "اپنی دکان کی فکر کرو تو دکان بھی تمہاری فکر کرے گی"۔ "مچھلی اور مہمان تین دن میں بُو دینے اُٹھتے ہیں"۔ "بیوی اور چولھے کی آگ کے بغیر گھر گویا بے جان جسم ہے"، وغیرہ۔ یہ قلاش سکالر جس کا ذہن رسا فلکیات کی سیر کرتا تھا اور جو اپنی جنتری کے لیے اجرام فلکی کے زائچے تیار کیا کرتا اور اسی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی سے اپنی بیوی اور اپنی تنگدستی کا ذکر بھی کر جاتا تھا ——— مفروضہ طور

پر اپنا مسودہ ایک ناشر بنجامن فرینکلن کے حوالے کر دیتا تھا۔

سال بہ سال غریب رچرڈ کی جنتری کی شہرت بڑھتی گئی اور اس کی ظرافت اور خوش طبعی کے گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے اس جنتری کی سالانہ دس ہزار جلدیں فروخت ہونے لگیں، گویا ہر سو امریکیوں میں سے ایک کے پاس یہ جنتری تھی اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد تو غالباً اس سے دس گنا تھی۔ ان میں سے بعض پڑھنے والوں نے رچرڈ سے جب پوچھا کہ وہ اپنی غربت کا ڈھونگ رچائے رکھنے میں کس طرح کامیاب ہے تو اس نے جواب دیا کہ اس کے منافع کا بڑا حصہ تو بنجامن فرینکلن خود ہضم کر جاتا ہے۔ میرے لیے پھر کیا خاک بچے گا۔ اس پر بھی بیوی کا یہ حال ہے کہ اپنی چندیا ٹھونک کر وہ سمجھتا ہے کہ اس سے شاید لطیف نکات نکل آئیں گے لیکن بے سود۔ اس خانۂ خالی میں کیا رکھا ہے۔

ایک نئی قسم کا مزاح ادب میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ وہ مخصوص، خشک اور کرارا امریکی مزاح تھا جس نے آرٹیمس وارڈ، مارک ٹوئین اور ول راجرز جیسے ادیبوں کو جنم دیا اور ادب میں پہلی بار ایک خالص امریکی افسانوی کردار ابھرا تھا۔ ہر قاری کو غریب رچرڈ میں کسی حد تک اپنی جھلک نظر آتی تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ بنجامن فرینکلن ناشر، مدیر، ظرافت نگار، معلّمِ اخلاق اور تاجر۔ خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ لیکن غریب رچرڈ اور بنجامن فرینکلن ایک جان دو قالب نہ تھے۔ رچرڈ کفایت شعار تھا۔ بین کے پاس جب بھی روپیہ ہوتا تو وہ اس سے پورا لطف اٹھاتا۔ گو پیسے کے بغیر بھی وہ حسب معمول فیاض اور قناعت پسند تھا۔ رچرڈ ترکِ منشیات اور کم سخنی کا مبلغ تھا۔ مگر اس کے

برخلاف بین شراب کا رسیا اور باتونی تھا۔ رچرڈ سلیقہ شعاری کی خوبیاں بیان کرتا تھا مگر بین کے لیے ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھنے کے مقابلے میں یہ یاد رکھنا زیادہ سہولت کا باعث تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ یہ ہیں چند انسانی لغزشیں بڑے آدمیوں میں سب سے زیادہ بھلے مانس کی جو ہر فن مولیٰ تھا۔

فرینکلن ۱۷۰۶ء میں بوسٹن میں بقول اس کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہؤا۔ اس کا باپ ایک شمع ساز تھا جس کے آباؤ اجداد آکسفورڈ شائر کے دیانتدار کاشتکار تھے۔ بین کی ماں نن ٹکٹ کی ایک سلیقہ شعار خاتون تھی جو اس ملک میں ایک کنیز یا یرغمال کی حیثیت سے آئی تھی۔

بین رفتہ رفتہ مالدار بھی ہوتا گیا اور شہرت بھی اس کے قدم چومنے لگی۔ لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ وہ آج ان سادہ لوح لوگوں سے بالاتر ہے جنہوں نے اسے یہ مرتبہ بخشا تھا۔ اس لئے اپنے اعمال سے اپنے آباؤ و اجداد کا نام روشن کیا۔

کسی عالم فاضل نے سکول میں اتنی کم تعلیم نہ پائی ہوگی جتنی فرینکلن نے پائی تھی بین نے باقاعدہ تعلیم صرف دو سال حاصل کی اور اس دوران بھی اس کی لاطینی بہت کمزور تھی اور ریاضی میں بھی وہ فیل ہوتا رہا، اور یہی وہ مضامین تھے جن سے مدرس کسی طالب علم کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا کرتے تھے، بعد میں اس نے اپنے طور پر فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانیں سیکھیں اور تب اسے پتہ چلا کہ ان زبانوں کی وجہ سے لاطینی زبان کو سمجھنا بھی آسان ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرینکلن کے مخزنِ معلومات میں جتنی بھی باتیں جمع ہوئیں وہ تقریباً سب کی سب اس نے خود

ہی سیکھیں ——— بجز فنِ طباعت کے، جسے اس نے اپنے بھائی جیمز کے شاگرد کی حیثیت سے کام کرنے کے دوران میں سیکھا، جیمز اس وقت امریکہ کا سب سے اچھا طابع تھا۔ یہ بچّہ بھی بہت جلد فنِ طباعت کا ماہر بن گیا۔ جیمز کے جذبۂ حسد اور بینؔ کی آزاد روی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جیمزؔ نے ایک دن اپنے چھوٹے بھائی پر مکّوں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد جیمزؔ نے ایک ایسے موزوں لڑکے کے لیے اشتہار دیا جو طباعت کا فن سیکھنے کا خواہش مند ہو۔

لیکن امریکہ بھر میں اس فن کے لیے سب سے زیادہ موزوں لڑکا اس وقت فلاڈلفیا کے گلی کوچوں کی خاک چھان رہا تھا۔ یہ سولہ سالہ لڑکا جو اپنے گھر سے ناراض ہو کر نکل بھاگا تھا۔ روزگار کی تلاش میں تھا اور جب اسے کام ملا تو وہ اس کام میں دل لگا کر زینہ بہ زینہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا سب سے اوپر پہنچ گیا۔

دس سال بعد بنجامن فرینکلن امریکہ کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا طابع و ناشر تھا جو جنتریاں، مذہبی کتابیں، نصابی کتب، قدیم ادب اور جدید انگریزی ادب کے شاہکار طبع کر رہا تھا۔ وہ پنسلوینیا، ڈیلاویر، میری لینڈ اور نیوجرسی کا تمام سرکاری طباعت کا کام بھی کرتا تھا وہ امریکہ میں جرمن زبان کے پہلے اخبار کا موسس تھا اور اس رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دے رہا تھا جو بعد میں سٹیرڈے ایوننگ پوسٹ بن گیا۔ یہ چھوکرا جو ایک دن گھر سے نکل بھاگا تھا اب خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور ایک کنبے کا مالک تھا۔

بیس سال کے اندر اندر بنجامن فرینکلن، فلاڈلفیا کا سب سے ممتاز شہری بن چکا تھا۔ یعنی صوبائی اسمبلی کا کلرک، رکن بلدیہ اور شہر کے پہلے فائر بریگیڈ کا بانی،

مزید دس سال گزرے تو وہ پنسلوینیا کے میسنس کا گرینڈ ماسٹر، فلاڈلفیا۔ اکادمی (فلاڈلفیا کا پہلا کالج) کا بانی، اس صوبے کا پہلا پوسٹ ماسٹر اور بس پر وہ اس صوبے کا ذمی اثر سیاستدان بن چکا تھا۔ فرینکلن نے امریکی فلاسوفیکل سوسائٹی کی بھی داغ بیل ڈالی۔ جس کا مقصد ملکی سائنسدانوں میں باہمی ربط پیدا کرنا تھا۔ اس سوسائٹی کے ارکان کی فہرست میں امریکہ کی سائنسی تاریخ کے بہت سے مشہور سائنسدان شامل ہیں۔ اور آج یہ ادارہ ہر سال ریسرچ کے اداروں کو عطیہ کے طور پر ہزاروں ڈالر دیتا ہے۔ فرینکلن نے ایک ایسا چولھا بھی ایجاد کیا جو چوتھائی ایندھن سے دُگنی حرارت دیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا نام بھی غریب رچرڈ کی طرح گھر گھر مشہور ہو گیا۔

اور پھر جب وہ چالیس برس کی عمر میں آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا اور اس کو بالکل وہی اہمیت حاصل تھی جو ایک بڑے مینڈک کو چھوٹے سے تالاب میں حاصل ہوتی ہے تو اچانک عالم گیر شہرت نے اس کے قدم چومے۔ ایک سفری پروفیسر سے اس نے شعبدوں کا کچھ سامان خریدا یعنی ایک ایسا مرتبان جس میں ہاتھ کی رگڑ سے بجلی کے شرارے جمع کیے جا سکتے تھے۔ کسی چھوٹے سے بچے ہی میں یہ شوق پیدا ہو سکتا ہے کہ اس جادو کے مرتبان کو کھول کر اس کا راز معلوم کیا جائے۔ لیکن ایک فلسفی ہی اس عقدے کو حل کر سکتا ہے اور چونکہ بنجامن فرینکلن میں ایک بچے کا تجسس اور ایک فلسفی کا کھوج، دونوں ہی باتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اس لیے اس نے چند ہی مہینوں میں برقی سائنس کے اسرار کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لیں کہ وہ ارسطو سے نیوٹن تک تمام سائنسدانوں کی معلومات پر حاوی تھیں۔ جب اس کی چوبی چھت والی تجربہ گاہ سے چنگاریاں نکلتی تھیں تو تماشبینوں کو پیچھے دھکیلنے کے

لیے زنجیریں تانی پڑتی تھیں۔

فرینکلن اس نکتے کو پانے والا پہلا شخص تھا کہ بجلی ایک رو ہے۔ وہ پہلا شخص تھا جو برقی رَو کو اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے دوڑا سکتا تھا۔ اور وہ پہلا شخص تھا جس کے ذہن نے یہ تصور قبول کیا کہ برقی رو ایک توانائی ہے۔ اس سے قبل کسی نے بجلی کے ذریعے نہ کسی پہیّے کو گھمایا نہ گھنٹی بجائی تھی۔ اس نے وہ اصطلاحیں ایجاد کیں جو ماہرین برقیات کی لغت میں آج بھی جوں کی توں موجود ہیں۔ چارج۔ انچارج۔ کنڈکٹر (موصل)، نان کنڈکٹر (غیر موصل)، مثبت برقی رو۔ منفی برقی رو وغیرہ۔ ان الفاظ اور اصطلاحات سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس نے برقیات کے بارے میں کتنی نئی باتیں دریافت کیں۔ آج یہ الفاظ اپنی تشریح آپ کرتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ بین نے ان اصطلاحات و الفاظ کو خود بھی سمجھا اور دنیا کو بھی سمجھایا۔

فرینکلن کے تجربات نے یورپی سائنسدانوں کے حلقوں کو چونکا دیا۔ ان تجربات و انکشافات کی بدولت اسے اس دَور کی علمی انجمنوں کی رکنیت ملی اور بڑی بڑی یونی ورسٹیوں نے "ڈاکٹر" کے لقب کے ساتھ اس پر اعزازی ڈگریوں کی نمائش کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فرینکلن کی فطانت کا شرارہ برقی رو کے ڈائنامو کو حرکت میں لا چکا تھا۔ بین کی تمنا تھی کہ کاش وہ اپنی موت کے ہر سو سال بعد زندہ ہو سکتا اور یہ دیکھ سکتا کہ اس کا ملک کس حال میں ہے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو یہ دیکھتا کہ اس کے اہلِ ملک برقی روشنی میں پڑھ رہے ہیں۔ بجلی کے تاروں کے ذریعے ٹیلی فون کر رہے ہیں اور برقی لہروں کی مدد سے خبریں سن رہے ہیں اور موسیقی کی محفلوں اور کھیل کود کے مقابلوں کا بچشم خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر پھر سے ابدی

نیند سونے سے قبل یقیناً اس کا چہرہ مسرّت سے جگمگا اٹھتا۔

جب فرینکلن کو ۱۷۵۳ء میں تمام امریکی نوآبادیوں کا پوسٹ ماسٹر مقرر کیا گیا تو اس کی انتظامی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ اس وقت ڈاک کے انتظامات بہت کم تھے، بے قاعدہ تھے اور اس کی ترسیل کی رفتار بے حد سست تھی۔ اس کا حساب کتاب ہمیشہ خسارے کے کھاتے میں رہتا اور اس کے قواعد وضوابط دفتریت کا شکار تھے فرینکلن نے داد وستد کا ایک ایسا قاعدہ رائج کیا جسے ادنےٰ سے ادنےٰ قابلیت کا پوسٹ ماسٹر بھی کسی دِقّت کے بغیر استعمال کر سکتا تھا۔ اس کی بدولت مختصر عرصے میں اس کا محکمہ منافع دکھانے لگا۔ ڈاک کی ترسیل اب سال کے تین سو پینسٹھ دن باقاعدہ طور پر ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں دن رات ہوا کرتی تھی۔ فرینکلن کے اصلاح کردہ ڈاک کے مواصلاتی نظام نے صوبوں کو آنے والی جدوجہد کے لیے مربوط کرنے میں سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے فرینکلن نے اس وقت کوارٹر ماسٹر کا منصب بھی سنبھال لیا۔ جب بریڈرک اپنی لال کرتی فوج کے ساتھ فرانسیسیوں اور سرخ ہندیوں کو پسپا کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ بریڈرک حمل ونقل کا نہ ٹھیک طور سے انتظام نہیں کر سکا تھا۔ لیکن فرینکلن نے دو ہفتوں کے اندر اندر نہ صرف ڈیڑھ سو گاڑیاں گھوڑوں اور ڈرائیوروں سے مکمل طور پر لیس کر کے اکٹھی کیں۔ بلکہ خورد ونوش اور ضروری سامان سے لاد کر انہیں حیران وششدر لیکن ممنونِ احسان کمانڈر کے پاس پہنچا دیا اور پھر جب بریڈرک کی ناکام مہم کے بعد یہ نوآبادی ایک طرف فرانسیسی بحری جہازوں اور دوسری طرف سرحدوں پر سرخ ہندیوں کے نرغے میں تھی تو بنجامن فرینکلن نے پہلی ملیشیا، کی تنظیم

لی اور خود بھی اس میں ایک ایسے معمولی سپاہی کی حیثیت میں شریک ہوا جو بندوق کاندھے پر رکھے پہرہ دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک لاٹری ڈالی اور اس کی آمدنی سے توپیں خریدیں اور اسمبلی میں شور مچا کر نوآبادی کو مسلح کرنے کا انتظام کیا۔

فرینکلن گو عقیدتاً ایک کوبکر جیسا امن پرست بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ بہت جوشیلا بھی نہ تھا۔ جب سرحد پر بعض جوشیلوں نے سرخ ہندیوں کے مظالم کا انتقام لینے کے لیے امن پسند اور مسیحی العقیدہ سرخ ہندیوں کے بچوں اور عورتوں کو بے دردی سے ذبح کر دیا اور سرخ ہندی مارے دہشت کے بھاگ کر فلاڈلفیا پہنچے جہاں ان کے پیچھے پیچھے ایک مشتعل ہجوم چلا آرہا تھا تو گورنر نے فرینکلن کو بلا کر ملیشیا کی کمان اس کے حوالے کی اور شورش فرو کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس کی بجائے فرینکلن غیر مسلح حالت میں مشتعل مجمع کے سامنے پہنچا اور محض زبانی الفاظ سے انہیں واپس کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرینکلن نے لندن میں اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تمہارا یہ نیازمند ایک معمولی سپاہی، ایک کونسلر ایک قسم کا آمر اور ایک مجمع بے ہنگام کے لیے سفیر، غرض سب کچھ بنا۔ لیکن گھر لوٹنے کے بعد وہ پھر سے ہیچمداں تھا۔"

یہ ہیچمداں ۱۷۶۴ء میں اس غرض سے لندن بھیجا گیا تاکہ پارلیمان، بادشاہ اور قدامت پسند حکمران جماعت کا سامنا کر کے پنسلوینیا، پھر میساچوسٹس اور بالآخر تمام نوآبادیوں کے لیے حقوق طلب کرے۔ ۱۷۶۶ء میں پارلیمان کے روبرو قابل نفرین اسٹامپ ایکٹ کے خلاف لڑنے کے لیے فرینکلن کی شہرہ آفاق تقریر اس بات کا مثالی نمونہ تھی کہ کسی قانون ساز مجلس کا کس طرح سامنا کیا جائے تھے یہ کوئی شکن لائے بغیر

فرینکلن ہر سوال کے جواب میں صرف دو تین واضح جملے کہتا تھا۔ وہ حقائق پر مضبوطی سے جما رہا اور اس طرح ایک دن میں ۱۷۴ سوالات کا جواب دیا۔ پارلیمان کو جلد ہی سٹیمپ ایکٹ منسوخ کرنا پڑا اور اس پر خود پارلیمان کو حیرت تھی۔ فرینکلن کے اس بیان سے جو طبع ہو کر یورپ اور امریکہ کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ اسے راتوں رات اپنے عہد کے ایک عظیم عملی سائنسدان کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ دنیا نے پہلی بار امریکہ کی حقیقی آواز سنی۔

گیارہ سال کے سفارتی تجربے کے بعد فرینکلن عین اس وقت نکل بھاگا جب برطانیہ اور اس کی امریکی نو آبادیاں آپس میں دست و گریباں ہو رہی تھیں۔ جب جولائی ۱۷۷۶ء کے گرم دنوں میں فلاڈلفیا میں برّاعظمی کانگرس کا اجلاس ہوا تو اس موقعہ پر فرینکلن کو ایڈمز اور جیفرسن کے ساتھ منشور آزادی مرتب کرنے کے لیے مامور کیا گیا۔ اس منشور کا اصل مصنف تو جیفرسن ہی ہے لیکن فرینکلن نے کئی مقامات پر اس کی زبان میں ترمیم و اصلاح کر کے اس کی نوک پلک سنواری اور اسے زیادہ معتدل اور واضح بنایا۔

اب اس نوزائیدہ قوم کو سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی تھی کہ بیرونی طاقتیں اسے تسلیم کر لیں۔ خصوصاً فرانس کو جو اس وقت انگلستان کا دیرینہ دشمن تھا۔ اس بات پر رضامند کرنا ضروری تھا کہ وہ ان بے سروسامان قلاش ریاستوں کو روپیہ قرض دے اور اسلحہ بھیجے۔ فرینکلن کے سر پر یہ ذمہ داری پڑی کہ وہ لوئی شانزدہم جیسے متلون مزاج آدمی کی خوشامد کر کے اس کے دیوالیہ خزانے سے ایک ایسی نوزائیدہ قوم کے لیے قرضہ حاصل کرے جس کے پاس نہ کوئی کفالت تھی نہ ضمانت اور جس کا ہر دم دم واپسیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن فرینکلن نے یہ کارنامہ بھی انجام دیا۔ انتہا یہ ہے کہ جب ٹیوبے کے مقام

پر آرنالڈ کو ارلانگ آئی لینڈ پر واشنگٹن کو شکست ہوئی اور ایسے وقت بھی جب برطانیہ فلاڈلفیا پر قابض ہو چکا تھا۔ فرینکلن تازہ قرضے حاصل کرتا رہا اور یہ سب کچھ اس عالم میں ہُوا کہ اس کے بعض سابق امریکی کمشنر اس سے حسد کرتے تھے اور پیرس میں مقیم برطانوی سفیر نے بڑی چالیں چلیں اور فرینکلن کی خفیہ مذاکرات تک میں اپنے جاسوس گھسا رکھے تھے۔

جہاں دوسرے سفرا، ہالینڈ، سپین اور پرشیا سے اپنے ملک کو تسلیم کرانے یا امداد دلانے میں ناکام رہے تھے وہاں فرینکلن نے فرانس میں کامیابی حاصل کی۔ اس کی کامیابی کا راز ایک تو اس کی اپنی شہرت تھی اور دوسرے یہ کہ مخلص لوگوں نے اسے ایماندار اور مخلص پایا۔ چالبازوں نے اپنے سے زیادہ چالباز پایا۔ عالموں نے اسے اپنے سے بڑا عالم پایا اور عام سیدھے سادے لوگوں کو یہ احساس ہوتا تھا۔ جیسے وہ انہی میں سے ایک ہے۔

امریکی ڈپلومیسی کی ڈیڑھ سو سال سے زائد تاریخ میں غالباً بنجامن فرینکلن سب سے زیادہ پختہ اور قابل ترین ڈپلومیٹ تھا۔ اس میں وہ دونوں صفات موجود تھیں جو ایک امریکی سفیر کے لیے ضروری ہیں ——— جس ملک میں اس کو سفیر مقرر کیا جائے اس ملک میں ہر دلعزیزی اور یہ وجدانی احساس کہ اس کے بیچھے اس کے اہل ملک کیا سوچتے ہوں گے۔ خواہ ان سے اس کا رابطہ قائم نہ ہو۔ یہ سہرا کسی اور امریکی سے زیادہ ——— اور اس قبیل میں واشنگٹن اور لی فائٹے مستثنیات نہیں ——— فرینکلن کے سر ہے کہ اس نے فرانس سے دوستی کا معاہدہ طے کرایا جس کی بدولت ڈیلی فورج کے امریکی فوجی دستوں کے حوصلے بڑھے اور امریکی انقلاب کو کامیابی نصیب

ہوئی۔ جب بالآخر درسائی میں فرینکلن ایک مستحکم قوم کے سفیر کی حیثیت سے پیش کیا گیا تو وہ اس وقت کے دستور کے مطابق ریشمی لباس، بالوں کی ٹوپی دوگ، اور ملبوس اور شمشیر بدست نہ تھا بلکہ بھورے رنگ کا کوٹ پہنے دستی چھڑی سنبھالے اور چوکور فریم کا چشمہ لگائے دربار میں داخل ہوا، اسے اس لباس میں یوں آنا پڑا کہ دنیا اسی لباس میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ اس نیک دل ڈاکٹر کی داستان زبان زد خاص و عام ہو چکی تھی اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں اس کے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ کار تھا۔ کہ وہ وہی لباس زیب تن کرے۔ جس کی تصویر ہر دستی پنکھے اور نسوار کی ڈبیہ کی زینت بنی ہوئی تھی۔

یارک ٹاؤن کے معرکے کے بعد صلح کی بات چیت کے لیے فرینکلن کی خدمات ابھی درکار تھیں۔ ان مذاکرات میں فرینکلن نے خارجی ڈپلومیسی کی تمام شاطرانہ چالبازیوں کی بساط الٹ دی اور امریکہ کے لیے وہ تمام مراعات حاصل کر لیں جو اسے مطلوب تھیں، یعنی مغرب میں دریائے مسی سی پی تک، فرینکلن نے اس کی مہم اسی قطعیت سے جیت لی۔ جس طرح واشنگٹن نے جنگ جیتی تھی۔

توپوں کی گھن گرج نے امریکہ میں اس کی واپسی کا اعلان کیا۔ گرجے کے مینار گھنٹوں کی آواز سے لرزنے لگے۔ فلاڈلفیا کا ہر ادارہ امریکی انقلاب کے سب سے بڑے غیر فوجی ہیرو کے خیر مقدم کے لیے چشم براہ تھا۔ یونین فائر کمپنی میں جس کی بنیاد فرینکلن نے پچاس برس قبل ڈالی تھی صرف چار پرانے ممبر باقی رہ گئے تھے۔ لیکن یہ چاروں اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ فرینکلن نے ان سے کہا کہ کمپنی کے اگلے جلسے تک وہ اپنی بالٹی اور کلہاڑی درست کر رکھے گا، اور ان کے ساتھ بدستور آگ بجھانے کا کام کرتا رہے گا۔

پنسلوینیا کی مجلس قانون ساز کا رکن منتخب ہونے کے باوجود وہ بہت جلد صدارتی کرسی پر فائز ہوگیا۔ اس مجلس میں گو قدامت پسندوں نے اپنے ووٹوں کی مدد سے اسے بھیجا تھا اور گو وہ اس وقت مالدار بھی تھا اور معمر بھی، تاہم اس کے خیالات وہی تھے جو غربت کے زمانے میں تھے۔ یعنی ایک آزاد خیال، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت چوکس، انتقامی اور طبقاتی قانون سازی کا دشمن اور انسانی حقوق کو ملکیتی حقوق پر بہرحال ترجیح دیتا تھا۔

جب ۱۷۸۷ء میں امریکہ کا دستور مرتب کرنے کے لیے کنونشن منعقد ہوئی تو فرینکلن انہی اصولوں کا علمبردار بن کر وہاں پہنچا۔ عرصہ ہوا اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ نوآبادیوں کا ایک وفاق بنانا چاہیے۔ اب امریکی قوم کی روحِ زنداں کو ایک قالب دیا جانے لگا۔ ان دنوں لوگوں کے غصّے کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن فرینکلن کی بذلہ سنجی اور حکمت عملی کی بدولت ان کے جذبات میں اعتدال آگیا ——— لنکن کی طرح فرینکلن کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ کوئی مزے دار قصّہ کہانی یا چٹکلا سنا کر غصّہ ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے اس کنونشن کو پھوٹ کے سبب ناکام ہونے سے بچائے رکھا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس امر کی مخالفت کی کہ رائے دہندگی یا عہدہ داری کے لیے املاک کی شرط رکھی جائے، اور آخر میں فرینکلن ہی نے کنونشن کا یہ سب سے بڑا عقدہ حل کیا۔ بڑی ریاستیں تو اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی چاہتی تھیں اور چھوٹی ریاستیں سب کے لیے مساوی ووٹ کی طلب گار تھیں۔ اس مسئلہ پر ہفتوں مندوبین میں تعطل قائم رہا۔ آخر کار فرینکلن نے سمجھوتے کی وہ بنیاد تجویز کی جس پر امریکہ کا موجودہ نظامِ حکومت قائم ہے یعنی ایوانِ نمائندگان میں آبادی کے تناسب

سے نمائندگی لیکن سینٹ میں مساوی ووٹ۔

اس وقت فرینکلن کی دُوربین آنکھیں جواب دے رہی تھیں۔ چنانچہ فطری ذہانت کے بل پر اس نے دُوہری نظر کے عدسے ایجاد کیے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اسے الماری کے سب سے اوپر کے خانے سے ضروری کتاب، سیڑھی پر چڑھ کر نکالنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ڈنگی کی مدد سے کتابیں نکالنے کا وہ طریقہ وضع کیا جو آج تک کتب خانوں اور بساط خانوں میں مستعمل ہے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں جب وہ چوراسی سال کا تھا ملک الموت کا پیغام آن پہنچا اور اس کے لیے اس عمر میں فرشتۂ اجل ناپسندیدہ مہمان نہ تھا۔

وہ اپنے پیچھے خیراتی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کے لیے بوسٹن اور فلاڈلفیا میں ایسا مشغول سرمایہ چھوڑ گیا ہے جو اس کے بعد سے آج تک سکالروں اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے کام آ رہا ہے سنہ ۱۹۹۱ء تک فرینکلن کی وصیت کا یہ بیعنہ پر وہاں نکال کر چالیس لاکھ ڈالروں تک جا پہنچے گا۔ اس رقم کا ایک حصّہ اس مقصد کے لیے مختص کیا گیا تھا کہ اس سے اس کے وطن بوسٹن کے ہائی سکول کے ذہین اور قابل طلباء کو ہر سال نقرئی تمغے دیے جائیں۔ چنانچہ اس رقم سے ہر سال تقریباً تیس تمغے عطا کیے جاتے ہیں اور سنہ ۱۷۹۳ء سے اب تک تقریباً ساڑھے چار ہزار مایۂ ناز نوجوان طلباء یہ تمغے حاصل کر چکے ہیں۔ جو لڑکا اپنی زندگی میں ناشر، مدیر، فکاہ نویس، موجد، سائنسدان، تاجر، مقنّن، مدبّر، مخیّر، محبِ وطن اور ہمہ صفت موصوف فطین بنا وہ آج بھی کسی ایسے امریکی سپوت کا متلاشی ہے جو اس کی جگہ لے سکے۔



تھامس جیفرسن

جمہوریت کا معمار اوّل

ایک تاریک وطن خشت ساز کے مکان میں کرائے پر لیے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں ایک نوجوان بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کا اسلوبِ تحریر اس کے سوادِ خط کی طرح مختصر لیکن پختہ ہے۔ جس طرح اس کی سطریں سیدھی ہیں اسی طرح اس کا اسلوب بھی موضوع کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ وہ کانگریس کے عام اجتماع میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نمائندگان کی جانب سے پیش کیے جانے والے اعلان آزادی کا مسودہ مرتب کر رہا ہے۔ موسم جون کا ہے۔ اس کمرے کا چھجہ پست ہے اور اس نوجوان کے سرخ بال کلف دار سفید وگ کے نیچے پسینے سے شرابور ہو چکے ہیں لیکن اس کا دل جوش سے لبریز ہے۔

"ہم ان صداقتوں کو خود آشکار سمجھتے ہیں کہ تمام انسان مساوی پیدا کیے گئے ہیں ——" نوجوان جیفرسن کو اس کا احساس تھا کہ بعض لوگ یہ کہہ کر اس بات کی ہنسی اڑائیں گے کہ دنیا میں کوئی دو آدمی ایک جیسے نہیں ہوتے ——

بعض اپاہج ہیں تو بعض تندرست، بعض احمق ہیں تو بعض خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ بہر حال وہ جانتا کہ ہم ایک جیسے نہیں ہیں لیکن مساوی ضرور ہیں ——— خدا کی نظروں میں مساوی ہیں۔ قانون کی نظروں میں مساوی ہیں۔ حصولِ مواقع کے حقوق میں مساوی ہیں اور اگر ہم اب تک مساوی نہیں ہیں تو اب ہمیں ہو جانا چاہیے۔

"——— یہ کہ خالق نے انسانوں کو چند ناقابلِ انتقال حقوق سے نوازا ہے۔ ان میں سے چند زندگی۔ آزادی اور مسرت کی تلاش ہیں........"

اس دن اس پینتیس سالہ جوان کے قلم سے امریکہ کا حقیقی معیار متعین ہوا۔

واشنگٹن کے برعکس جیفرسن نے کبھی جنگ میں حصّہ نہیں لیا۔ وہ ایک غیر فوجی ہیرو تھا۔ گو وہ غلاموں کو آزاد نہیں کرا سکا تاہم اس نے اس کی کوشش کی اور اس کوشش میں اُسے اس حد تک کامیابی نصیب ہوئی جس حد تک اس نوزائیدہ قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کیے بغیر ممکن تھا۔ اخلاقی عظمت اور ہمہ جہتی فطانت کے بل بوتے پر تھامس جیفرسن، لنکن اور واشنگٹن کا ہمسر نظر آتا ہے کیونکہ وہ شخص جو عام انسانوں کا نقیب تھا خود انتہائی غیر معمولی انسان تھا۔

اس کی ماں رینڈالف خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس کی رگوں میں امارت کا خون دوڑتا تھا۔ لیکن اس کا باپ ایک عام آدمی تھا۔ سترہ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اس نیلی آنکھوں اور چھدرے چھدرے سرخ بال والے لڑکے نے خود اپنی کفالت پر ولیم اینڈ میری کالج میں داخلہ لیا اور بڑی محنت سے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی یادداشتیں طرزِ حکومت، قانون، اخلاقیات اور فلسفہ کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔ چنانچہ جب پڑوس کی البیمارلے کاؤنٹی والوں نے اس نوجوان قانون دان

کو ورجینیا کی صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب کیا تو اس وقت وہ ملک کے ان گنے چُنے افراد میں سے ایک تھا جن کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور جو طبعزاد مفکر تھے اس کی شادی بھی انہی دنوں ہوئی تھی۔ اس وقت امریکہ کے باشندے اس نصب العین کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جو جیفرسن کے پیش نظر تھا، ویلیمبرگ میں انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں تا آنکہ ۱۷۶۹ء میں شاہی گورنر نے باغی اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ جیفرسن اور دوسرے ارکان، اسمبلی سے نکل کر ایک سرائے میں جا بیٹھے اور وہاں انہوں نے گورنر کے بغیر ہی اپنا کام جاری رکھا۔ پیٹرک ہنری، جارج میسن لائٹ ہارس ہیری لی (جنرل لی کا باپ)، اور جارج واشنگٹن کی رفاقت میں جیفرسن نے دوسری نو آبادیوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ سب کی سب ایک بر اعظمی کانگرس میں شرکت کریں۔ اس کانگرس کے مندوب اور اس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے جو اعلان آزادی کو مرتب کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی وہ دنیا کے روبرو اس جمہوری فلسفے کا اعلان کرنے کے قابل ہو گیا تھا جو آج بھی اہلِ امریکہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس عظیم دستاویز کی تصنیف کے سلسلہ میں فرینکلن، جارج میسن اور جیمز ولسن نے بعض مشورے دیے لیکن اس سے قبل کے ایک بیان میں کانگرس نے اہلِ امریکہ کے لیے زندگی، آزادی اور ملکیت کے حقوق کا مطالبہ کیا تھا۔ نوجوان جیفرسن نے جو خود بھی صاحب جائداد تھا۔ اس کا آخری لفظ کاٹ کر اعلان آزادی میں اس کی بجائے ایسے الفاظ لکھے جن کا اطلاق غریب ترین شخص پر بھی ممکن تھا۔ یعنی "مسرت کی تلاش" اسی لیے کہ وہ مسرت پر یقین رکھتا تھا۔ اور وہ عوام کا احترام کرتا تھا اور اس کا مشاہدہ تھا کہ عوام کے پیسے ہی سے جنگ کے اخراجات کی تکمیل ہوتی ہے اور جنگ میں عوام ہی کا

خون بہتا ہے۔

برّاعظمی کانگرس کی رکنیت، تیسری بار قبول کرنے سے انکار کر کے جیفرسن بڑے انکسار کے ساتھ ورجینیا کی ریاستی اسمبلی میں واپس چلا گیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہاں زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جب خونیں میدانوں میں انقلاب کی جنگ برپا تھی اس وقت یہ کہنہ مشق مدبّر امن کے حصول کے لیے کام کر رہا تھا۔ نئی آزادی کے تقاضوں کے مطابق قدیم جاگیردارانہ اور امارت نوازانہ قوانین پر نظر ثانی کر کے اس نے ایسی انقلابی تبدیلیوں کا تصوّر کیا ———— نہ صرف تصوّر بلکہ ان کو روبہ عمل لے آیا، جو قانون کی اعلیٰ نظریہ بن گئیں۔ اس نے وہ قانون منسوخ کر دیا جس کی رُو سے باپ کی وراثت کا حق دار صرف اس کا سب سے بڑا لڑکا ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ خود اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے مفت سرکاری تعلیم کا ایک نظام قائم کیا اور مسیحیت کی تاریخ میں پہلی بار اس نے مملکت کو کلیسا کی گرفت سے آزاد کرایا اور اس طرح اس نے متنبہ کیا کہ ہر وہ شخص جو ضمیر کی آزادی کو عزیز رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ دوسروں کی اس آزادی پر حملے کا بھی مقابلہ کرے۔ انقلاب کے دوران میں ورجینیا نے اسے دو بار اپنا گورنر بنایا اور ایک بار تو وہ صرف پانچ منٹ کی تاخیر کے سبب ٹارلٹن کے چھاپہ ماروں کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ لیکن انگریز سپاہیوں نے جیفرسن کے مکان "مانٹی سیلو" کو جو شارلٹسویل کے قریب تھا، ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ وہ جنگی قیدیوں کے ساتھ تپاک اور ہمدردی سے پیش آتا تھا۔

جنگ جب ختم ہو گئی تو جیفرسن نے تیسری بار گورنر بننے سے انکار کر دیا اور ۱۷۸۳ء میں ریاست ہائے متحدہ کی کانگرس میں شامل ہوا۔ کانگرس کے ہر اجلاس میں اس نے نظامِ حکومت کی تعمیر کے لیے نئی اور قیمتی تجاویز وضع کیں۔ پونڈ اور شلنگ کی جگہ اس نے

موجودہ ڈالر اور سینٹ کو دی۔ اس نے ان علاقوں کے لیے نظامِ حکومت وضع کیا جنہیں اس وقت تک ریاست کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ ورجینائی ہونے کے باوجود اس نے مسی سی پی کے مشرق میں موجودہ وسطی مغربی علاقہ کے بارے میں ورجینیا کے حقوق دائمی طور پر وفاقی حکومت کے حوالے کر دیے۔ وہ کم سے کم اوہائیو کے شمال میں غلامی کا رواج ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح اس نے غالباً ترازو کو اس طرح جھکا دیا جس کے باعث خانہ جنگی میں وفاقی حکومت کا پلڑا بھاری رہا۔

اس مرحلے پر واشنگٹن نے جیفرسن کو فرانس میں سفیر بنا کر بھیجا جہاں اس نے بیسٹیل کے سقوط کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد واشنگٹن نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اسے طلب کر لیا۔ ایڈمس کے تحت وہ نائب صدر تھا اور ۱۸۰۰ء میں عوام نے خود اسے تیسرے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا۔ وہ پہلا صدر تھا جس کی صدارت پر فائز ہونے کی رسم واشنگٹن میں ادا کی گئی۔ جب وہ حلف وفاداری اٹھانے کے لیے وہائٹ ہاؤس سے کیپٹال کو پیدل تنہا اور کسی حفاظتی پہرے کے بغیر روانہ ہوا تو دنیا نے دیکھا کہ اس مرتبہ ان کا حکمران ایک نئی قسم کا آدمی ہے۔

جیفرسن کے عہد میں اہلِ امریکہ نے اپنے قومی قرضے کا بڑا حصہ ادا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسوں میں بھی تخفیف کی گئی۔ ٹیکسوں کے بارے میں اس کا کہنا تھا — "ادائیگی براہ راست کرو"۔ جیفرسن میں عوام کو اپنی مرضی کا لیڈر مل گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھاری اکثریت سے اس کو دوسری بار بھی صدر منتخب کر لیا۔ اس اعتماد کے جواب میں جیفرسن نے ان کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا رقبہ دگنا کر دیا۔ ڈیڑھ کروڑ ڈالر کے عوض اس نے نپولین سے دریائے مسی سی پی اور کوہستان راکیز

کے درمیان چپہ چپہ خرید لیا۔ اس کے دشمنوں نے لوزیانہ کی اس خرید کو بے جا فضول خرچی قرار دے کر خوب شور مچایا .... حالانکہ اس نے دنیا کے ایک زرخیز ترین خطے کو چار سینٹ فی ایکڑ سے بھی کم نرخ پر خریدا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس علاقے سے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے لیوس اور کلارک سے کہا کہ وہ دریائے کولمبیا کے دہانے تک کے علاقے پر امریکی پرچم لہرا دیں اور اس طرح شمال مغربی بحرالکاہل کے ساحل پر کینیڈا، میکسیکو اور روس کے قدم جمانے کے مواقع ختم کر دیے جائیں۔ اس نے اس براعظم کے جنوب کی طرف بھی نظر ڈالی اور اسے خوشی تھی کہ بولیوار پے در پے ایک کے بعد دوسرے ملک کو اسپین کے استبداد سے نجات دلا رہا ہے۔ اس نے مستقبل کا بھی جائزہ لیا اور اچھی ہمسائیگی کی پالیسی کی بنا ڈالی۔ اس نے ہسپانوی زبان روانی کے ساتھ بولنا سیکھ لیا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ شمالی امریکہ کے تمام باشندوں کو یہ زبان سیکھنی چاہیئے۔ جیفرسن نے لکھا ہے۔ "میں تمام امریکی اقوام میں دوستانہ اخوت دیکھنا چاہتا ہوں اور حکمت عملی کے ایک ہی نظام میں ان کا باہمی اتحاد دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو گی کہ برازیل اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بحری بیڑے ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح اور ایک ہی منزل کی جانب دوش بدوش بڑھیں

۱۸۰۹ء میں جیفرسن نے ایک بار پھر ایک ہی عہدے کی تیسری میعاد قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور سیاسیات سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر کے مانٹیسیلو میں اپنے دیہی مکان میں جا کر بس گیا۔ یہاں وہ معمار، کسان، موجد، ماہر نباتات اور فلسفی کی حیثیت سے اپنی متنوع اور قدرتی صلاحیتوں کو روبکار لایا۔

آج بھی اس کی خوبصورت قدیم حویلی میں اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے آلات دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مُرغِ بادنما جو ڈائل کے ساتھ ہال میں نصب ہے۔ گھومنے والا نعمت خانہ، سرنگیں اور خفیہ زینے، ایسی مشین جو بیک وقت ایک خط کی کئی نقلیں کرتی تھی اور وہ گھڑیال جس کے لنگر توپ کے سے گولوں سے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں سات لنگر ہیں اور ہر لنگر ایک دن گھڑیال چلاتا ہے۔ مانٹیسیلو میں بعض گھریلو سانحات کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی چہیتی بیوی مارتھا اسکلٹن اور اس کے چھ بچوں میں سے چار عنفوانِ شباب میں چل بسے۔ اس کے باوجود مانٹیسیلو سے اس کی وابستگی میں زندگی بھر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جیفرسن ایک محنتی باغبان اور سائنٹیفک کاشتکار تھا۔ چنانچہ مٹی کو زرخیز بنانے اور ترچھا ہل چلانے میں وہ وقت سے بہت آگے تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے بہترین قسم کا ہل ایجاد کیا اور ایسے غیر ملکی پودے جیسے کارک والا شاہ بلوط زیتون اور پہاڑی چاول کاشت کیے اور پھر انہیں ملک بھر میں تجربہ کرنے والوں میں تقسیم کر دیے۔

یہ حویلی جس کا تفصیلی نقشہ خود جیفرسن نے تیار کیا تھا۔ کوئی پینتیس سال میں مکمل ہوئی۔ جیفرسن ایک پیدائشی معمار تھا۔ اس نے ایک انتہائی مدفی اور منطقی فن کے ذریعے اصل میں اپنی اسی قوتِ تعمیر کا ٹھوس شکل میں اظہار کیا جو اس کے سیاسی کردار میں بھی عیاں ہے، مانٹیسیلو کی برجیاں اور ستون متناسب و متوازن بازوؤں نے اس طرزِ تعمیر کی بنا ڈالی جو "جنوبی زمینداروں کا طرزِ تعمیر" کہلاتا ہے۔ اس معمار نے اپنی صلاحیتیں اسی وقت ظاہر کر دی تھیں جب اس نے لی انفانت کو وفاقی دارالحکومت کا نقشہ مرتب کرنے میں مدد دی تھی۔ آج بھی

امریکہ کے قومی کلیسا کیپٹال کے گنبدوں اور ستونوں میں اسی کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے اور اسی طرح جس طرزِ تعمیر کی نیو پڑی ، اس کی نقل ریاستی اسمبلیوں کے ایوانوں میں بھی کی گئی اور بعد ازاں پیرس اور لندن اسے لے اُڑے ۔

لیکن اس کا محبوب اور قابلِ فخر شاہکار یونیورسٹی آف ورجینیا کی عمارت ہے ۔ جس کی ایک ایک اینٹ تک کا تفصیلی خاکہ اس نے تیار کیا تھا ۔ اس نے نہ صرف اس کی خوبصورت عمارتوں اور صحن کے خاکے بنائے بلکہ اس نے خود یونیورسٹی تخلیق کی ۔ جس کا یہ نقشہ آگے چل کر درسگاہوں کا مثالی نقشہ بن گیا ۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم میں قدیم کلاسیکی ادب اور دینیات کے رواج کو ختم کر کے اس نے جدید لسانیات ، آزاد علوم و فنون اور غیر فرقہ وارانہ انتظامیہ پر زور دیا ۔ جب اس نے یونیورسٹی میں زراعت کا بھی ایک شعبہ اور فلکیات کے مطالعہ و مشاہدہ کے لیے ایک رصدگاہ قائم کی تو اس وقت کے فاضلانِ دہر چونک اُٹھے ۔

جیفرسن کا بنیادی سیاسی عقیدہ یہ تھا ۔ اگر تم امریکی عوام کے سامنے حقائق رکھو تو وہ سوجھ بوجھ سے عمل کریں گے ۔ چنانچہ اس نے امریکہ کے ہر قصبے کے لئے ایک ایک مفت سفری کتب خانوں کے قیام پر زور دیا ۔ خود کانگرس لائبریری کی بنیاد جیفرسن کی اپنی جمع کی ہوئی دس ہزار کتابوں کے عطیے پر رکھی گئی ۔ ان تمام کتابوں میں انجیل مقدس سب سے زیادہ پسند تھی اور اسی کا اس نے سب سے زیادہ مطالعہ کیا تھا ۔ اس امر کے پیشِ نظر کہ سرخ ہندی قبائل کو بھی انجیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے ۔ اس نے انجیل کا ایک مختصر ایڈیشن " جیفرسن بائیبل " کے نام سے مرتب کیا ۔ یہ دراصل " مسیح کی زندگی اور اخلاق " کے عنوان کے تحت عہد نامہ جدید کا

ایک سلیس خلاصہ ہے۔ تھامس جیفرسن نے اپنا ذاتی مذہبی عقیدہ یہ بیان کیا۔ "میں صرف ان معنی میں مسیحی ہوں جن معنی میں خود حضرت مسیح کسی کو مسیحی بنانا چاہتے تھے۔ یعنی پورے خلوص کے ساتھ دوسری تمام تعلیمات کے بالمقابل صرف ان کی تعلیمات سے وابستہ ہوں، اسی سادہ اور پرخلوص مسیحیت سے اس جمہوریت کے تصوّر نے جنم لیا جس کا خاکہ جیفرسن نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

نئے جیفرسن میموریل کے سنگِ گوشہ کے نیچے "جیفرسن بائیبل" کا ایک نسخہ بھی دفن ہے جو پریذیڈنٹ روزویلٹ نے ۱۹۳۹ء میں نصب کیا تھا۔ یہ وسیع گول گنبد والی عمارت ایک سو فٹ بلند ہے۔ اس کو یونانی سادگی اور متانت کے اس طرز پر تعمیر کیا گیا ہے جو اس عظیم معمار صدر نے خود ایجاد کیا تھا۔ یہ عمارت دریائے پوٹومیک کے کنارے چیری کے شگوفوں سے گھری ہوئی ایستادہ ہے اور اسی کے سفید مرمر کے پتھروں سے نور پھوٹتا معلوم ہوتا ہے اس میموریل کے اندر ایک ایسے شخص کا دیو قامت مجسمہ نصب ہے جس کی عظمت کو کوئی سنگ تراش پتھر کے قالب میں نہیں ڈھال سکتا۔

اس کے باوجود "لمبو ٹام" جیسا کہ لوگ اسے پیار کے نام سے پکارتے تھے، بڑا ہی ملنسار اور باغ و بہار آدمی تھا۔ وہ عورتوں کی تعظیم کرتا، بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتا اور پھولوں پر جان چھڑکتا تھا۔ اس میں ایک بچے کا سا جذبۂ تجسس و تخلیق تھا۔ وہ ایک مہم جُو دماغ کا مالک تھا جس کا رُخ ہمیشہ مغرب کی سمت یعنی ہمارے مستقبل کی طرف تھا۔ وہ اپنی نجی عادات میں سادگی پسند تھا، لیکن مہمان نوازی میں فیاض واقع ہوا تھا۔ اپنے سیاسی

حریفوں یعنی فیڈرلسٹ پارٹی کے تابڑ توڑ اور شدید حملوں میں بھی اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور متانت میں کوئی فرق نہ آیا۔ دنیوی امور میں اگرچہ وہ پہلے ہی بڑی سوجھ بوجھ کا مالک تھا تاہم وہ ایمان داری سے یہ کہا کرتا تھا۔ "ایک گرما دینے والے خیال کی جھلک میرے نزدیک پیسوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ٹھامس جیفرسن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے، اس کے دماغ کی وسعتوں اور جوش و جذبے کی بلندی کو ناپنے اور اس کی بوقلمونی شخصیت کو جانچنے کے لیے دس ماہرین کی ضرورت پڑے گی۔ معمار جیفرسن، فلسفی جیفرسن، قانون دان جیفرسن، موجد، کاشتکار، ادیب، انجیل کا متعلّم اور معلّمِ اخلاق، ماہر نباتات، مدبّر اور امریکہ کے دوسرے انقلاب کا قائد جیفرسن، یعنی اس لڑائی کا قائد جو عوام پر یقین رکھنے والوں اور ان سے خائف رہنے والوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ لیکن امریکہ کے تیسرے صدر کی صلاحیتیں جانچنے کے لیے جب ماہرین کی فہرست مرتب کی جائے تو ہمیں ایک موسیقار، ایک مہندس، ایک ماہر لسانیات، ایک درباری، ایک کتب بین، ایک ماہر معاشیات، ایک ماہر معدنیات، ایک فکاہ نویس، ایک باغبان اور ایک عاشق ——— کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔ اس کے باوجود ہم اس کی عبقریت کے تمام خیرہ کن پہلوؤں کا مکمل احاطہ نہ کر سکیں گے۔

تاریخ نے ۴؍جولائی ۱۸۲۶ء کا دن ——— یعنی اعلانِ آزادی پر دستخط ہونے کے پندرھویں یوم سالگرہ کو جیفرسن کے دنیائے فانی سے دنیائے جاودانی میں سفر کے لیے منتخب کیا۔ اپنے پیچھے وہ یہ الفاظ چھوڑ گیا۔

"میں اس توقع کے بغیر نہیں مروں گا کہ روشنی اور آزادی برابر رواں دواں ہیں۔ اگر بربریت یا مطلق العنانی کے بادل یورپ کے علوم و فنون اور روایات آزادی پر چھا جائیں اور انہیں نظروں سے اوجھل کر دیں تب بھی یہ مُلک روشنی اور آزادی کو برقرار رکھے گا، اور دوبارہ یورپ میں انہیں بحال کرے گا ——— ۴ر جولائی ۱۷۷۶ء کو جو شعلے بھڑکائے گئے تھے وہ دُنیا کے اتنے بڑے حصے پر پھیل چکے ہیں کہ مطلق العنانی کے کمزور وسائل انہیں بجھا نہ سکیں گے اس کے برعکس یہ شعلے خود ان وسائل کو بھسم کر ڈالیں گے اور ان لوگوں کو بھی پھونک ڈالیں گے جو انہیں استعمال کرتے ہیں۔

طویل قامت، شفیق مزاج، متجسّس اور کسی قدر آگے جھکا ہوا وہ اب بھی اپنے سادہ لباس اور دوستانہ لیکن پر وقار انداز میں ہمارے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ وہ ایک امن پسند انسان تھا لیکن آج بھی وہ ہماری طویل ترین جنگ میں ہمارا قائد ہے کیونکہ اسی نے کہا تھا "میں نے آستانۂ الٰہی پر قسم کھائی ہے کہ میں ذہن انسانی پر ظلم کی ہر شکل کے خلاف ابد تک جہاد کروں گا۔"



والٹیئر

آزادی کا شرارہ

"میں آپ کے لفظ لفظ سے اختلاف کرتا ہوں لیکن آپ کے اظہارِ خیال کے حق کے لیے مرتے دم تک لڑوں گا۔"

اگر آپ پوچھیں کہ سب سے پہلے کس نے یہ بات کہی تو بہت سے لوگ فخریہ طور پر جواب دیں گے۔ "والٹیئرؔ نے" ـــــ لیکن اس عظیم فرانسیسی معلّم اخلاق کے مسلک کا یہ نچوڑ اس کے اپنے الفاظ میں نہیں ہے۔ یہ جملہ اصل میں اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے اور اس میں گویا آزادیٔ خیال کے لیے اس کی زندگی بھر کی جدوجہد کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کے دَور میں والٹیئر عصرِ جدید کا پیش رو تھا اور اسی نے اس دَور کو ادراک و استدلال کے دَور میں تبدیل کیا۔ اس نے بار بار یہ نعرہ لگایا۔ "اپنے آپ سوچیئے"۔ جب ایک قوم سوچنا شروع کر دیتی ہے تو پھر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے کسی اور ہم عصر نے عوام کی اتنی بڑی تعداد کو اپنے

طور پر سوچنا نہیں سکھایا اور اس کی اس تعلیم سے یورپ بھر میں روشنی کی جو لہر پھیلی اور جو اب بھی ہمارے افق پر تابندہ ہے اُسے کوئی طاقت نہ روک سکی۔

جو لوگ آپ کو اپنی عقل استعمال کرتے نہیں دیکھنا چاہتے وہ عام طور پر اس کو سنکی قرار دیتے ہیں۔ محض اس لیے کہ والٹیئر نے ان کے اس حق پر زور دیا ہے کہ وہ جس بات پر یقین نہ کر سکتے ہوں۔ اس کے بارے میں بجا طور پر شبہ کریں۔ جن لوگوں نے والٹیئر کی تحریروں کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا ہے وہ آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ والٹیئر ایک ملحد تھا وہ اس کا جواب ان لوگوں کو نہیں بلکہ اپنے خالق کو ان الفاظ میں دیتا ہے :—

اے خدائے نادیدہ! کہ تیرے کرشمے تیری ذات پر دلیل ہیں
اے خدا! میرا یہ قطعی اقرار سُن لے
اگر کبھی مَیں نے کوئی غلطی کی ہے تو وہ تیرے قانون کی تلاش میں تھی۔
میرا دل راہ سے بھٹک سکتا ہے لیکن اس میں بس تیری ہی ذات کا جلوہ ہے —

ظاہر ہے یہ الحاد نہیں بلکہ ایک تائب اور عاجز دل کی پکار ہے جو بالخصوص معلّمینِ اخلاق میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ والٹیئر نے کبھی مذہب کی سادگیوں پر حملے نہیں کیے۔ اس نے دراصل اس وہم پرستی اور سریع الاعتقادی کا مذاق اُڑایا ہے جو مذہب کے ساتھ ایک ذلّت آمیز فریب ہے۔

جس بچے کو آگے چل کر والٹیئر کے قلمی نام سے مشہور ہونا تھا وہ ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا نام فرینکوئی میری اروئے

رکھا گیا۔ سات سال کی عمر میں وہ ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ اس کی صحت بچپن ہی میں ایسی خراب ہوئی کہ ساری عمر بحال نہ ہو سکی۔ وہ غیر معمولی طور پر دُبلا پتلا تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ قد و قامت میں بھی چھوٹا تھا۔ یہ جوشیلا جس کے لبوں پر ہر وقت خندہ استہزا کھیلتا رہتا تھا۔ اسے اپنے اسباق سے غیر فطری حد تک لگاؤ تھا اور اس کی گفتگو میں کچھ اتنی دل کشی تھی کہ لوگ اس کی ستم ظریفی پر تاؤ کھاتے تو باتوں باتوں میں وہ ان کا غصّہ فرو کر دیتا تھا۔

سترہ برس کی عمر میں اس نے صاحب قلم بننے کے ارادے کا اعلان کیا۔ اس کے والد کو پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا کیونکہ روشنائی تو جیسے اس کی گھٹّی میں پڑی ہوئی تھی۔ نظموں اور ڈراموں کا ایک سیلاب اس میں سے اُمڈتا رہتا تھا۔ اس کا باپ ایک اوسط درجے کا فرانسیسی تھا جو دولت مندوں کی صف کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سماجی طور پر وہ بڑا سخت گیر پارسا تھا۔ وہ ترقی کے زینے جلد سے جلد طے کرنے کا خواہشمند تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنے بیٹے کو ذلّت کی زندگی سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ اس نے زبردستی ایک وکیل کے دفتر میں اسے نوکر رکھا دیا۔ یہاں یہ نوجوان بری طرح ناکام رہا۔ جب اسے سفارتی ملازمت کے سلسلہ میں ہالینڈ بھیجا گیا تو اس نے جاتے ہی سفارتی عہدے کا پہلا ضابطہ توڑ دیا۔ وہاں اس نے ایک لڑکی کو لے بھاگنا چاہا جب کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ جب بڑی ذلّت کے ساتھ اسے واپس وطن بھیج دیا گیا تو اس نے پھر تصنیف و تالیف کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر اس کے باپ نے کہا۔ "مصنف بنوگے تو بھوکوں مروگے۔" اور پھر اس نے بیٹے کو ورثے سے بیدخل

کرکے اس کی قسمت کا رخ پھیرنے کی کوشش کی۔ کوئی پیشین گوئی شاید اتنی غلط ثابت نہیں ہوئی جتنی والٹیئر کے باپ کی۔

دس سال کے اندر اندر نوجوان موسیو والٹیئر پیرس جیسے بے مروت شہر میں یکہ و تنہا مالی طور پر اس قدر آسودہ حال تھا کہ کوئی شاعر اتنی آسودگی کو پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کامیابی کو بڑی مدد محکمہ احتساب سے ملی جس نے اس کی تقریباً تمام تصانیف ممنوع قرار دی تھیں اور پھر پولیس سے جو عام طور پر اس کے ڈراموں کو تیسری رات ہی بند کر دیا کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیرس کے فیشن ایبل طبقے نے ڈراموں کی ابتدائی راتوں ہی میں جوق در جوق تھیٹر جانا اور ڈراموں کے چبھتے ہوئے فقروں کو زبانی یاد کرنا شروع کر دیا۔ اس کی کتابیں کچھ اس طرح خریدی اور پڑھی جاتی تھیں جیسے یہ کسی خفیہ جماعت کے پمفلٹ ہوں اور پھر یہ بیرونی ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔ اس طرح مصنف کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ حکام کے اس الزام میں کہ والٹیئر اپنی تصانیف کے ذریعہ عوام کے اخلاق کو تباہ کر رہا ہے ایسا کوئی اشارہ نہ تھا کہ وہ ناشائستہ باتیں لکھتا ہے۔ اس کا مطلب کچھ اس قسم کا تھا جیسے ان دنوں روس میں سمجھا جاتا ہے یعنی حکومت پر تنقید کرنا یا کھلے بندوں اربابِ اقتدار پر شک و شبہ ظاہر کرنا بدترین قسم کی "غیر اخلاقی" حرکت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ والٹیئر کے ڈرامے اور عجیب و غریب ناول ایران، یونان، پیرو یا چین کے پس منظر میں لکھے جاتے تھے لیکن ہر شخص اس کے بین السطور مطلب کو سمجھ کر ان سے خوب لطف اندوز ہوتا اور قہقہوں سے دُہرا ہو جاتا تھا لیکن قہقہہ ایک ایسا جھُلس دینے والا شعلہ ہے جس کو بجھا دینے کا سامان کوئی حکومت نہیں کر سکتی لیکن آمریت کی روایات کے مطابق والٹیئر کو بیسٹیل

میں قید کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں حکومتوں کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی کو قید کرنے کے لیے اس کے خلاف کوئی الزام ثابت کریں بلکہ محض شبہ کی بنا پر کسی کو جیل بھیج دیا جا سکتا تھا اور وہاں اسے اس وقت تک سڑنا پڑتا تھا جب تک کہ کوئی با اثر دوست ——— اگر کوئی ہو۔ بد نصیب قیدی کو باہر نہ نکالے اور والٹیئر کے دوستوں کو اسے باہر نکالنے میں گیارہ مہینے لگ گئے جب وہ رہا ہوا تو اس کی کمزور صحت اور تباہ ہو چکی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ دبلا، پتلا اور سفید ہو گیا تھا۔ کٹار کی طرح سفید اور پتلا آری کی طرح خیرہ کن اور خطرناک ——— اس حد تک خطرناک کہ جب ایک احمق اوباش نواب شیولیئر ڈی روھاں نے اس پر توہین آمیز جملے کئے اور والٹیئر نے ان جملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تو شیولیئر کے کاسہ لیسوں اور خدمت گاروں نے اسے راستے میں گھیر لیا اور لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مارا۔ اِدھر نواب صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے خدمت گاروں کو مار پیٹ کے سلسلہ میں ہدایات دیتے رہے۔

والٹیئر کسی حد تک اپنے خلاف تو ناانصافی برداشت کر لیتا تھا لیکن دوسروں سے بے انصافی ہوتی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب فرانس کی سب سے بڑی اداکارہ ایڈرینی لیکوریٹر پر نزع کی حالت طاری تھی تو والٹیئر اس کے بالیں پر تھا اور اس نے یہ سُنا کہ پادری صاحب اسے آخری وقت میں اپنے فن کو شرمناک قرار دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں یہ ایک عام رواج تھا جس پر ایکٹر طوعاً و کرہاً آمادہ ہو جاتے تھے لیکن عظیم فن کارہ لیکوریٹر

نے نزع کی شدید تکلیف میں بھی بڑی تمکنت کے ساتھ پادری کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر پادری صاحب دعا کیے بغیر ہی اُٹھ کر چلے گئے اور قبل اس کے کہ اس کے دوست احباب اس کی نعش دفن کرتے۔ پولیس نے بڑی پھرتی سے اس کی لاش کو ایک گڑھے میں جھونک دیا اور اس پر چونا ڈال دیا۔ اس دن کے بعد سے والٹیئر کے دل میں مسیحیت کے خلاف نہیں جیسا کہ اس پر الزام عائد کیا جاتا ہے بلکہ غیر مسیحی ظلم و تشدد کے خلاف ہمیشہ کے لیے نفرت بیٹھ گئی۔ اور یہ ظلم خواہ فرانس میں ہوتا یا کسی اور ملک میں، پروٹسٹنٹ فرقے سے سرزد ہوتا یا کیتھولک عقیدے کے حامیوں سے وہ اس کی پر زور مذمت کیا کرتا تھا۔ "جو شخص مجھ سے یہ کہتا ہے"۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "میرے عقیدے پر ایمان لے آؤ ورنہ خدا تمہیں غارت کر دے گا۔ وہ گویا مجھے یہ دھمکی دے رہا ہے کہ میرے عقیدے پر ایمان لے آؤ ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔"

ایسے لب و لہجے کا حامل شخص آج بھی بعض ممالک میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ والٹیئر بہت جلد دوبارہ بیسٹیل میں قید کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ فرانس کو خیر باد کہہ دے گا۔ چنانچہ رہائی کے بعد وہ بڑے اشتیاق سے انگلستان کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ۱۷۲۶ء میں وھٹ سنڈے کو لندن میں اترا اور اس روز اس نے دریائے ٹیمز کا مشہور شاہی جشن دیکھا۔ اسے اس بات سے بے حد تعجب ہوا کہ برطانوی تاجدار سے لوگ خائف نہیں ہوتے بلکہ اس سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ وہ ویسٹ منسٹر ایبی میں سر آئزک نیوٹن کی تدفین کے منظر سے بڑا متاثر ہوا۔ اس لیے کہ اس کے وقت کے فرانس میں کسی سائنس دان

کو نہ تو نائٹ کا اعزاز بخشا جا سکتا تھا۔ نہ اس کی اتنی شاندار تدفین ممکن تھی۔ وہ انگریز تاجروں اور کاروباری لوگوں کی دولت مندی اور ساکھ سے بڑا متاثر ہوا۔ اور اس بات سے بھی کہ انگریز قوم زندہ شعراء کو بھی ملٹن اور شیکسپیئر جیسی عزت و توقیر بخشتی ہے۔ پارلیمان کی قوت اور اس کی آزادی کو دیکھ کر اسے بڑا اچنبھا ہوا اور ان سب سے بڑھ کر برطانوی انصاف و عدالت کی کارکردگی پر وہ عش عش کرنے لگا۔

اگر وہ جارج سوم کے عہد کے انگلستان کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہو سکتا تھا۔ تو خدا معلوم آزادی کی امریکی مثال پر اس کا کیا تاثر ہوتا۔ وہ صرف ایک امریکی بنجمن فرینکلن سے واقف تھا اور اس کی بڑی قدر کرتا تھا بھلا وہ اس نوجوان کو اپنے ہیجان خیر دل سے اس قدر شدت سے نہ بھینچتا جس نے یہ لکھا تھا کہ تمام لوگ مساوی پیدا کیے گئے ہیں اور یہ کہ ہر ایک کو زندگی، آزادی اور تلاش مسرّت کے ناقابل انتقال حقوق حاصل ہیں۔" اس لیے کہ یہ وہ خیالات تھے جو خود والٹیئر نے جیفرسن کی پیدائش سے ایک عرصہ قبل ظاہر کیے تھے۔ یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ امریکہ کے اعلانِ آزادی کا مصنف والٹیئر کی تصانیف کا عمیق مطالعہ کرتا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ہم سب اپنی روزمرہ زندگی میں اس عظیم فرانسیسی مجاہدِ حرّیت کے زیر بار احسان ہیں۔

۱۷۲۹ء میں جب والٹیئر پینتیس سال کا تھا۔ اسے فرانس لوٹ آنے کی اجازت ملی اور حکومت کو اپنے اس فیصلے پر جلد ہی پچھتانا پڑا۔ ایک ریاضی دان سے جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ اس سال سرکاری خزانے کے خازن سے قومی لاٹری کے ٹکٹوں کی اجرائی کے حساب میں غلطی ہوگئی ہے تو والٹیئر نے ایک

سنڈیکیٹ تشکیل دی جس نے تمام ٹکٹ خرید لیئے۔ جب خازن کو اپنی افسوسناک لغزش کا احساس ہوا تو اس نے لاٹری کی رقم دینے سے انکار کردیا۔ لیکن مرتشی نظم و نسق کے چالاک دشمن نے اس مسئلہ میں عدالت کی طرف رجوع کیا، اور دل جیب سو دے کے حصے کے طور پر اسے ڈھائی لاکھ ڈالر کی ڈگری مل گئی۔ اس سوجھ بوجھ سے کام لے کر جو کسی شاعر یا فلسفی کو شاذ ہی ملتی ہے۔ لیکن انگریزوں کے کاروباری طور طریقے دیکھ کر اسے حاصل ہو گئی تھی۔ والٹیئر نے یہ رقم امریکہ، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے حصوں میں مال بھیجنے کے کاروبار میں لگا دی۔

والٹیئر بڑی بے باکی سے اپنی امارت سے حظ اٹھاتا تھا۔ وہ نہ تو کوئی ولی تھا نہ راہب، وہ آسائش، قیمتی کپڑوں اور خوب صورت گاڑیوں کا دل دادہ تھا۔ اسے دنیا کی تمام اچھی چیزیں پسند تھیں اور وہ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتا تھا کہ اگر انہیں دنیا میں مسرت نصیب ہو تو وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ وہ عیش و عشرت کے متوالوں اور عیاش پادریوں کی طرح ان مصائب کو "خدا کی مرضی" کہہ کر نظر انداز نہ کرسکتا تھا۔ اس قسم کے تنگ خیال اور آدم بیزار فلسفے کو چیلنج کرنے کے جرم میں اسے فاسق و فاجر ٹھہرایا گیا۔ پھر اسے بدکار کہا جانے لگا۔ اس لیے کہ ۱۷۳۳ء سے ۱۷۴۹ء تک وہ ذہین ایملی مارکوئیس ڈیوشا طیلے کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ جو ایک عیاش نواب کی مطلقہ بیوی تھی۔ نواب نے محض گھر والوں کے کہنے پر اس سے شادی کی تھی، اور پھر دوسری عورتوں کے پیچھے پڑ کر اس بے چاری کو چھوڑ دیا تھا۔ آج کا زمانہ ہوتا تو ایملی کو طلاق مل سکتی تھی یا وہ اپنا نکاح فسخ کرا سکتی تھی، اور والٹیئر جو تادم مرگ اس کا وفادار تھا اس کے ساتھ

شادی کر لیتا۔ جب سے اس کی ملاقات اس پیکرِ لطافت سے ہوئی تھی، دوسری عورتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں والٹیئر پاکباز اور ملنسار رہا اور خواتین کے حلقوں میں اس کے دوستوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں حسین اداکارہ لیکوریئر سے لے کر بڑھاپے میں متبنیٰ کی ہوئی۔ ایک لڑکی تک ساتھی، جسے وہ پیار سے 'مالن' کہا کرتا تھا۔

وہ عیوب سے پاک نہ تھا۔ مثلاً خودستائی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بات بات میں وہ لڑائی مول لیتا تھا اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تیر و نشتر کا کام دیتے۔ جب کوئی چارۂ کار نہ دیکھتا تو جھوٹ بول کر صاف بچ نکلتا اور جب حقیقی خطرے میں گھر جاتا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ وہ تن آسان تھا۔ کیونکہ بے آرامی سے اسے نفرت تھی۔ کبھی کبھار کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے خود کو بیمار تصور کرتا یا جھوٹ موٹ بیمار پڑ جاتا۔ کیونکہ وہ ناخوشگواری اسے بیماری سے زیادہ گراں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود والٹیئر کا تصورِ اخلاق ان لوگوں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ جو اس کے کردار پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اس کے نزدیک انسان اپنے عمل میں آزاد اور اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار تھا اور اس کا ضمیر اس کا سب سے بڑا محتسب تھا۔

اگر انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے تنہا اپنے آپ پر حکومت کرنا چاہیئے۔ اگر انسان کے سر پر ظالم مسلط ہوں تو اسے ان کا تختہ الٹ دینا چاہیئے۔ اور اس پر اس نے اس چبھتی ہوئی حقیقت کا اضافہ کیا۔" ہمارے شداد خود ہماری بداعمالیاں ہیں اور جن برائیوں سے وہ شدید نفرت کرتا تھا وہ گھناؤنی نفس پرستی نہیں

بلکہ ظلم و تعدّی، نا انصافی اور عدم رواداری تھیں۔ یہ برائیاں ہمارے دلوں میں جاگزین ہیں جہاں ہم انہیں اس وقت تک پالتے رہتے ہیں جب تک کوئی والٹیئر ہی ہمیں نہ ٹوکے۔

اور یہ سب کچھ وہ اس ذکاوت سے کرتا تھا۔ جس نے احساس انصاف سے جِلا پائی تھی جو غصّے کو مزاح میں تبدیل کرتی اور آگ کو روشنی سے بدل دیتی تھی۔ وہ مذاق میں کہا کرتا تھا۔ میرا پیشہ یہ ہے کہ جو بات ذہن میں آئے وہ کہہ ڈالوں اور جو باتیں اس کے ذہن میں آئیں وہ ننانوے جلدوں پر مشتمل تھیں۔ اس نے اپنے خیالات اپنی نظموں اور ناولوں میں، کتابچوں اور مضامین میں اور ان دس ہزار خطوط میں بیان کیئے ہیں جو اس نے یورپ کے تمام مشاہیر کو لکھے تھے۔ روس کی کیتھرائن اعظم کو یہ خیال رہتا تھا کہ اس کے جوابات اتنے جلد جلد نہ دیے جائیں۔ کہ والٹیئر ان سے بور ہو جائے۔ مزید براں کیتھرائن والٹیئر کو شاندار تحائف بھی روانہ کیا کرتی تھی۔ کرسچین ہفتم والئ ڈنمارک نے اس بنیاد پر والٹیئر سے عملاً معافی مانگی تھی کہ وہ اس کی پیش کی ہوئی تمام اصلاحات کو یک دم نافذ نہ سکا۔ سویڈن کے شاہ گستافس سوم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ والٹیئر کے بتائے ہوئے انسان دوستی کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گا۔ فریڈرک اعظم جو ان دنوں پرشیا (جرمنی) کا ولی عہد تھا۔ جب والٹیئر کو پوٹسڈام تک کا سفر اختیار کرنے کی ترغیب میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس کے چرن چھونے کے لیے بھیس بدل کر خود ہی چلا آیا۔

والٹیئر سے ملاقات کرنے والوں کو اس کا صحیح پتہ معلوم رکھنے

میں بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ یا تو ایک جگہ سے بھاگ کر دوسری جگہ چھپتا پھرتا تھا یا اُسے ملک در ملک بھاگتے رہنا پڑتا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی ہر کتاب اربابِ اقتدار کی آتش غیظ و غضب کو بھڑکاتی تھی اور بہت جلد یا تو تصنیف یا پھر اس کا مصنف کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ بیشتر اوقات محکمہ احتساب اس کی کتاب کے نئے ایڈیشن کو سر بازار نذر آتش کر دیتا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ سارا یورپ ان شعلوں کی روشنی میں یہ پڑھ سکتا تھا کہ فوجی حکام جادو کے ٹوٹکوں، بادشاہوں کے ابدی حقوق، زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کرنے والوں، مابعد الطبیعات کے پروفیسروں مختلف فلسفیوں کے ضابطہ ہائے حیات، تکفیر کا مقدس محکمہ اور ان لوگوں کے بارے میں والٹیر کی رائے کیا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب ٹھیک ہے اور بس دنیا یوں ہی بھلی ہے۔ جب کبھی والٹیر قدم اٹھاتا وہ کسی کے پاؤں پر ہی جا پڑتا۔ وہ کسی شخص کو ایک ہی جملے میں فنا کر سکتا تھا۔ کارڈینل مزارین کے بارے میں مثلاً اُن سے کہا "وہ ان تمام نیکیوں کا خطا کار تھا جو وہ نہ کر سکا" یہ بات والٹیر کی جادو دانیت کا ایک جزو ہے کہ جو بات اس نے ایک شخص کو اپنے ذہن میں رکھ کر کہی تھی اس کا اطلاق آج کے بعض سیاستدانوں پر بھی ہوتا ہے۔

ایمیلی دو شاطیلے کی موت کے بعد اپنے وطن مالوف سے اس کے سارے بندھن ٹوٹ گئے جہاں اسے اتنی کڑی سزائیں دی گئی تھیں۔ چنانچہ والٹیر نے فریڈرک اعظم کی اس مستقل دعوت کو قبول کر لیا کہ پوٹسڈام میں اس کے پرشئین دربار کو نوازے۔

ان دونوں نے عالم شباب میں ایک دوسرے کو بے حد سراہا تھا۔ لیکن دونوں ہی

خود سر، خود بین و خود پسند، طاقت ور اور چالاک تھے۔ والٹیئر سے قریبی ربط قائم کرنے کے بعد فریڈرک پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس کا شہرہ آفاق مہمان درباری مسخرے کے منصب پر قانع نہیں ہو سکتا تھا۔ والٹیئر، فریڈرک اور پرشیا کے امیرزادوں کی فوجی ذہنیت کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ پرشیا کا یہ درباری اپنے آپ کو مہذب ثابت کرنے کی جو کوشش کرتا تھا۔ والٹیئر بڑے تحقیر آمیز انداز میں اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ چنانچہ وہ فریڈرک کے پہلو میں ایک کانٹا بن کر اترتا گیا۔ بالآخر فریڈرک نے غصّے کی ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس کانٹے کو نکال پھینکا۔ اور والٹیئر نے پھر ایک بار اپنے آپ کو بے یار و مددگار پایا اور اس مرتبہ فریڈرک کے منتقمانہ دباؤ کے زیر اثر یورپ کی تمام سرحدیں اس پر بند کر دی گئیں۔

آخر کار ۱۷۵۴ء میں اس سن رسیدہ فلسفی کو ننھی سی آزاد جمہوریہ، جنیوا میں پناہ ملی۔ یہاں اس نے ایک مکان خریدا اور اس کی کشش اس جگہ یورپ کے ہر اس بڑے شخص کو کھینچ لائی جو اس کے آستانے تک سفر کر سکتا تھا۔ اس آستانے پر وہ اسے خیر مقدم کے لیے اپنا منتظر پاتے۔ اس کا نزار و نزار جسم زرق برق والے زرد ساٹن کے کوٹ میں ملبوس ہوتا۔ دھندلائی ہوئی آنکھیں پھر ایک بار روشن ہوتیں۔ اس کی وہی فرشتے کی سی مسکراہٹ اس کے جھریوں جیسے بھرے چہرے پر پھیل جاتی۔ کافی کے فنجان پر فنجان چڑھائے۔ والٹیئر رات گئے تک ان مجلسوں میں جو یورپ میں بہترین تصور کی جاتی تھیں، اپنی فقید المثال گفتگو سے مہمانوں کی ضیافت طبع کا اہتمام کرتا۔ لوگ تین دن قیام کے ارادے سے آتے اور تین تین ماہ ٹھہر جاتے۔ خدا بس مجھے میرے دوستوں سے محفوظ رکھے۔ والٹیئر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا اپنے

دشمنوں سے تو میں خود ہی نمٹ لوں گا۔

اس کی فیاضیاں اس کی مہمان نوازی کی بہ نسبت ڈھکی چھپی تھیں۔ کئی غریب اور مسکین، سیاسی یا مذہبی منتقمانہ کارروائیوں کا شکار ہو کر اس کے در پر آتے اور پناہ طلب کرتے۔ اس نے ان کے لیے مکان تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ دیکھتے دیکھتے اس کی اس سرزمین پر پورا ایک گاؤں بس گیا اور اسے ایک گرجا اور پھر ان کے بچوں کے لیے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرانا پڑا۔ اس نے اپنے گاؤں کے باشندوں کو ان کی صلاحیت کار کے مطابق کام پر لگا دیا۔ یہ لوگ نجاری سے جفت سازی تک اور مویشی پالنے سے لے کر پارچہ بافی تک ہر قسم کا کام کیا کرتے تھے۔ ان پناہ گزینوں میں سے بہت سے سوئس گھڑی ساز تھے۔ والٹیر بہت جلد گھڑی سازی کے پھلتے پھولتے کاروبار کا سیلز ایجنٹ بن گیا۔ وہ اپنی گھڑیاں دوسروں کے مقابلے میں ایک تہائی قیمت کی کمی پر فروخت کرتا تھا۔ ان گھڑیوں کے لیے وہ اشتہارات خود ہی لکھتا تھا۔ اگر ان میں سے ایک خط بھی آج کسی کے پاس ہو تو وہ دنیا کی کسی قیمتی گھڑی سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

والٹیر کے آخری ایام بڑے سکون سے گزرنے چاہئے تھے۔ وہ اب بہت مال دار تھا۔ گو اس کے کار خیر کی طویل فہرست اس کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ مسرت تھی اور وہ آخری دم تک بڑے سکھ اور چین سے رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کی تلخ ترین جنگیں اور تصانیف ابھی باقی تھیں۔ ۱۷۶۲ء میں جبکہ ٹولوز کے مذہبی جنونی اس شہر میں چار ہزار خارجیوں کے قتل کی دو سودیں برسی منا رہے تھے کہ ایک نوجوان شخص ایک کھلیان میں پھانسی پر لٹکا پایا گیا۔ افواہیں یہ تھیں کہ وہ

ایک پروٹسٹنٹ تھا۔ جو رومن کیتھولک بننا چاہتا تھا اور مذہبی جنونیوں نے یہ رائے قائم کی کہ اس کے باپ ژاں کیلاس نے جو ایک کمزور اور شریف شخص تھا اپنے توانا بیٹے کو پھانسی دے دی ہے۔ ژاں کیلاس پر وحشیانہ مظالم توڑے گئے۔ اس کے باوجود جب اس سے کچھ قبولوایا نہ جا سکا تو اُسے دار پر لٹکا دیا گیا، اور قانون کا غم و غصہ بجلی بن کر اس کے خاندان کے دوسرے ارکان پر گر پڑا۔

جب والٹیئر نے اس معاملہ میں دلچسپی لی تو اُس نے ان تعزیراتی قوانین کی دہشت انگیز نوعیت کو بتدریج بے نقاب کرنا شروع کیا۔ جو فرانس اور یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں ——— بجز انگلستان کے نافذ تھے۔ ان قوانین کے تحت جیوری کوئی نہ تھی۔ ملزم کو اپنی صفائی کے لیے کوئی وکیل نہیں دیا جاتا۔ اس کی حمایت میں کوئی شہادت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ الزام عائد کرنے والے خفیہ شہادت دیتے تھے اور جج خود کو استغاثہ تصور کرتے تھے۔ علاوہ ازیں والٹیئر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بیشتر فوجداری قوانین ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے اور محض قانون دانوں کے حافظے میں محفوظ ہیں اور وہ کسی کو سزا دینے کی خاطر جس ڈھنگ سے چاہیں ان کی تشریح کر لیتے ہیں۔ یہ دہشت خیز صورت حالات کچھ نئی نہ تھی بلکہ ازمنۂ تاریک سے یہی دستور چلا آتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں مالدار اور اثر و رسوخ کے مالک حضرات کو فوجداری قوانین کی وحشیانہ کارکردگی کا کوئی علم نہ تھا اور وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ جو غریب بے چارے قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں وہ قدرتی طور پر بدچلن ہیں۔

والٹیئر اپنے تمام اثر و رسوخ اپنی کثیر دولت اور اس غراہٹ کے ساتھ میدان عمل میں اتر پڑا۔ جو ضمیر کی للکار کی طرح جہاں تک پہنچتی تھی لوگوں کو

خوف زدہ اور ہراساں کر دیتی تھی۔ تین سال ہیں اس کے بیان کے مطابق مسکرانے کے لیے بھی وقت نکالنا وہ مناسب نہ سمجھتا تھا۔ اس کی بے خواب راتیں، قانون دانوں، اربابِ کلیسا، بادشاہوں اور تمام یورپ کے پریس پر اس مطالبے کے ساتھ بھرپور حملے کرنے میں گزرتی تھیں کہ کیلاس کے مقدمے کی نئے سرے سے سماعت کی جائے۔ بالآخر بادشاہ کو ان عوام کے مطالبے کے آگے سرِتسلیم خم کرنا پڑا۔ جن میں والٹیر نے بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ اس نے سارے معاملے پر نظرِ ثانی کی۔ مردہ اور زندہ لوگ بے گناہ قرار دیے گئے اور ٹاڈلوس کی عدالت کو اپنی نازیبا حرکت کا تمام ریکارڈ محو کرنا پڑا۔ حکومتوں نے اور قانون دانوں نے گزشتہ آٹھ سو سال سے تعزیراتی قانون کی اصلاح کے جس کام پر توجہ نہ دی تھی وہ اب ایک بجا طور پر ناراض مردِ ضعیف نے شروع کر دیا تھا۔

جوں ہی کیلاس کا مقدمہ جیتا گیا۔ وہ تمام لوگ والٹیر کے پاس دوڑے ہوئے آئے جن کے ساتھ اسی قسم کی ناانصافی کی گئی تھی۔ اس نے ان تمام لاقانونیوں کو بے نقاب کیا جو اس وقت بے چون وچرا قبول کی جاتی تھیں۔ ایک بات جس پر اسے بے حد غصہ آیا۔ اربابِ کلیسا کے وہ اختیارات تھے جن کی رُو سے وہ کلیسائی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے عامیوں کو الزام دینے، ایذا پہنچانے اور پھر دار پر لٹکانے کے مختار تھے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ مذہب، سیاست اور قانون سے بے تعلق ہو جائے اور بس روحانی امور کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ جن کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے اس مطالبہ کا دشنام طرازی سے خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن والٹیر نے قانون شکنی اور گناہ کے فرق کی الجھنوں کو رفتہ رفتہ سلجھا دیا۔

جہاں تک گناہ کا تعلق ہے اس کی سزا خود خدا دے گا۔ اگر اس کی مرضی ہو۔ جہاں تک قوانین کا تعلق ہے ہمیں قوانین سے محبت کرنا چاہیے۔ ہمیں ان کا احترام کرنا اور ان کا تمام بار برداشت کرنا چاہیے۔ وہ شخص جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اپنے ملک سے محبت نہیں کرتا۔ اور یہ قانون کی پابندی کرنے اور مظالم کے خلاف سینہ سپر ہونے والا مجسم فیشن زدہ مرد ضعیف اپنے ہم وطنوں سے بہر حال الفت رکھتا تھا وہ مرنے سے قبل ایک بار اپنے محبوب شہر پیرس کو دیکھنے کی ناقابل برداشت خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ دسمبر ۱۷۷۸ء کو ایک دن کسٹم چوکی کے ایک افسر نے ایک گاڑی یہ دیکھنے کے لیے روکی کہ کہیں اس میں کوئی قابل محصول اندازی اشیاء تو نہیں۔ گاڑی کے اندر سے ایک نحیف لیکن شگفتہ آواز آئی۔ "بھئی میرے سوا کوئی ناجائز شئے اس میں نہیں ہے۔" چنگی افسر نے گاڑی کے پٹ کھول دیے۔ "ارے!" وہ حیرت سے چلّا اٹھا۔ "موسیو والٹیر!" اس لیے کہ اس کی جھرّی دار مسکراہٹ سے اب وہ لاکھوں لوگ بھی آشنا ہو چکے تھے جنھوں نے کبھی اسے گوشت پوست میں نہیں دیکھا تھا۔

پیرس اس کے خیر مقدم میں دیوانہ ہو گیا۔ وہی نیشنل اکیڈمی جس نے محض روایات کے پابند ہیچ دانوں کے لیے جگہ پیدا کرنے کی خاطر اسے برسوں تک نظر انداز کر رکھا تھا۔ اب اس نے اس سب سے عظیم معلمِ اخلاق کے لیے اپنی آغوش وا کر دی ——— "کومیڈی فرانسیسے" کی عمارت کے زینوں پر اس ڈرامہ نگار کو خوش آمدید کہنے کے لیے پوری کاسٹ جمع تھی۔ اس کا نیا ڈرامہ آغاز سے اختتام تک تعریف و توصیف کے فلک شگاف نعروں میں دیکھا گیا۔ تقریبات کا سلسلہ بالآخر اس مرد ضعیف

کو تراسی سال کی عمر میں بستر مرگ پر کھینچ لایا اور یقیناً وہ اس قسم کی موت کو بہت ہی خوش گوار قرار دیتا۔ اس کی آخری عبارت جو اس نے اپنے سیکرٹری کو لکھوائی۔ اس کے زندگی بھر کے مسلک پر صاد ہے۔

"میں خدا کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے، اپنے دوستوں کی محبت دل میں لیئے، اپنے دشمنوں سے نفرت نہ کرتے ہوئے اور توہّمات کو ناپسند کرتے ہوئے مر رہا ہوں ——"

(دستخط) والٹیئر

مئی ۱۷۷۸ء میں اسے پیام اجل ملا۔ ارباب کلیسا نے اسے دفن کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ممکن تھا اس کی لاش کا بھی وہی حشر ہوتا، جو ممتاز اداکارہ لیکوربیٹر کا ہوا۔ مگر اس کے دوست اس کی لاش اس طرح آپس میں سنبھالتے ہوئے لے گئے جس سے سنتریوں کو یہ دھوکا ہوا جیسے والٹیئر زندہ ہے۔ پھر بعجلت تمام شہر سے باہر لے جا کر اس کے شایان شان تدفین کی۔

لیکن فرانس جو اپنے چیرہ دستوں کے خلاف برابر جد و جہد کر رہا تھا۔ بالآخر اس شخص کا ہمنوا ہو گیا۔ جس نے نعرہ لگایا تھا "لوگو! بیدار ہو جاؤ، اپنی زنجیریں توڑ ڈالو" ۱۷۹۱ء میں جب فرانس کا انقلاب اپنے شباب پر تھا۔ والٹیئر کا جسد خاکی واپس پیرس لایا گیا اور رات بھر بیسٹیل کے کھنڈروں پہ فاتحانہ انداز میں رکھا گیا۔ بلاشبہ عملاً یہ والٹیئر ہی کے کمزور و ناتواں ہاتھ تھے۔ جنہوں نے بالآخر اس رسوائے زمانہ کال کوٹھڑی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کوئی ڈھائی لاکھ اشخاص نے اس رات گھڑ سوار اور پیدل فوج کے دو رویہ دستوں

کے مابین طویل قطاروں میں جوق در جوق آکر فرانس کے اس عظیم فرزند کو آخری بار خراج عقیدت پیش کیا، اسے بعد ازاں پانتھیاں میں دفن کیا گیا جہاں فرانس کی تمام عظیم شخصیتیں دفن ہیں۔ جب جلوس میت روانہ ہوا تو ایک پرچم لہرایا گیا جس پر یہ شعر درج تھا ؎

اس نے پر پرواز دیئے ذہن بشر کو
شائستہ و آزاد کیا فکر و نظر کو



موزارٹ

کرشمہ ساز موسیقار

بس آخری محفل موسیقی ——— سات برس سے بھی کم عمر کا موسیقار بیٹا بجائے گا، وائلن پر نغمہ سنائے گا اور کلیویئر کی سروں کو کپڑے سے چھپا کر سمفنی کی دھنیں بجائے گا اور اس آسانی سے بجائے گا جیسے وہ سُروں کو دیکھ رہا ہے۔ دور بیٹھ کر یہ نغمے کے ہر سُر کا الگ الگ نام بتا دے گا، اور جتنا عرصہ بھی کہا جائے گا۔ بے تکان بیٹا بجائے گا۔ ٹکٹ صرف نصف تھیلر۔

سنہ ۱۷۶۳ء میں ایک جرمن اخبار میں مندرجہ بالا اشتہار اس انداز سے دیا گیا جیسے یہ ایک شعبدہ باز کا تماشا تھا۔ یہ اشتہار دنیا کے انتہائی ذہین

موسیقار ولف گینگ ایمے ڈیئس موزارٹ کے بارے میں تھا۔ سامعین میں ایک اور لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ یہ گوئٹے تھا جس کی تقدیر میں بھی لازوال شہرت لکھی تھی۔ برسوں بعد بھی گوئٹے کو وہ منظر یاد تھا کہ کس طرح ایک بچہ جس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ارغوانی ساٹن کے زرق برق لباس میں ملبوس، پاؤڈر لگی وِگ پہنے ننھی تلوار لٹکائے بھاگتا ہوا بینا کے سامنے بنچ پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے اپنے آپ کو نغمے میں ڈبو دیا۔

موزارٹ پیدائشی مغنّی تھا اور قدرت نے اسے بچپن ہی سے موسیقی کے زیر و بم سے مکمل آگہی، تال اور سُر کا قطعی احساس اور سازوں کی ہم آہنگی کے بارے میں بلا کا فہم و ادراک ودیعت کیا تھا۔ یہ ننھا موسیقار ایک ایسی مکمل خداداد صلاحیت کے ساتھ دنیا میں آیا جو کسی کے احاطۂ ادراک میں نہ آتی تھی۔ تین سال کی عمر میں یہ بچہ کلیویئر (موجودہ پیانو کا پیش رو) بجانے لگا اور پانچویں برس اس نے زندگی میں پہلی بار وائلن اٹھایا اور اپنے باپ اور اس کے ایک دوست کی سنگت میں دیکھا دیکھی ہی میں چھ نغمے بجا گیا اور اس دوران میں وہ ایک بار بھی نہ تال سُر سے ہٹا نہ آہنگ سے منحرف ہوا۔

ہر نسل میں چند بچے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو موزارٹ کی متنوّع صلاحیت کی حد تک نہ سہی۔ بہرحال موسیقی سے حیرت انگیز شغف کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ بچہ تو ابتدا ہی سے موسیقی نگار بھی تھا اس لیے کہ وہ خطوط لکھنے اور پڑھنے سے کہیں پہلے موسیقی کی علامات لکھ پڑھ سکتا تھا۔ موسیقی کے مورّخ موزارٹ کے فن کا سنجیدگی سے تجزیہ کرتے وقت ان تمام دھنوں کو بھی شمار کرتے ہیں جو اس نے

چھ سال کی عمر ہی میں لکھنی شروع کردی تھیں۔ ان دھنوں میں بھی موزارٹ کی انفرادیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی دل کشی، قطعیت اور بے روک ٹوک روانی ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک منفرد اسلوب اور ایک عظیم روح کی تخلیق ہیں۔ اس بچّے کا ذہن اور اس کی انگلیاں دونوں ہی قدرت کا عطیہ تھیں۔ نو سال کی عمر میں اس نے دنیا کا سب سے بڑا اور انتہائی پیچیدہ آرگن بجا کر ولندیزیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اسے وٹیکن کا ایک طویل اور ادق مذہبی گیت ——— (MISERERE) سنایا گیا، جسے اس قدر خفیہ رکھا گیا تھا کہ کسی کو دین مسیحی سے اخراج کا خطرہ مول لیے بغیر اس کے سکور کی نقل کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس بچے کے ذہن نے ایک ایک سُر کو اس طرح جذب کیا کہ گھر پہنچ کر اس نے محض اپنی یادداشت سے ساری دُھن صحیح صحیح لکھ ڈالی اور پاپائے روم نے اُسے دین سے خارج کرنے کی بجائے نائٹ آف دی گولڈن شپر کا اعزاز بخشا۔

اس عجوبہ روزگار بچے کا باپ لیوپولڈ موزارٹ ایک تیسرے درجے کا دھنیں نظم کرنے والا، ایک دوسرے درجے کا وائلن نواز اور بہترین مدرس تھا۔ وہ آسٹریا کے شہر سالزبرگ میں رہتا تھا۔ ولف گینگ ۱۷۵۶ء میں وہیں پیدا ہوا تھا۔ باپ اپنے بچے کی خداداد صلاحیتوں کا احترام تو ضرور کرتا تھا۔ لیکن ان کو کمائی کا ذریعہ بنانے کا تہیّہ کر چکا تھا۔ چنانچہ ولف گینگ کی بڑی بہن کی معیّت میں جو خود ایک باکمال پیانو نواز تھی۔ اس کا باپ اسے برسوں آسٹریا، جرمنی، فرانس، انگلستان، اٹلی اور ہالینڈ گھسیٹتا پھرا۔ ان بچوں نے فرانس اور انگلستان کے حکمرانوں اور آسٹریا کے شاہی خانوادے کے سامنے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ

کیا۔ اس موقعہ پر اس ننھے لڑکے کا پاؤں محل کے فرش پر رپٹ گیا جس سے اسے بڑی سخت چوٹ آئی لیکن ایک چھوٹی بچی نے جس نے اسے بڑی پھرتی سے سنبھال لیا تھا اسے بڑی تسلی دی۔ سپاس تشکر کے طور پر موزارٹ نے اس سے وعدہ کیا کہ بڑا ہونے کے بعد وہ اسی سے شادی کرے گا۔ لیکن میری انٹونی کی تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

کچی ناہموار اور کیچڑ سے لت پت سڑکوں پر بگھیوں کے جھٹکے کھانے، گندی سراؤں میں قیام کرنے اور کئی کئی گھنٹے مسلسل کام کرنے کے باوجود اس ننھے لڑکے کا جوش اور ولولہ سرد نہیں پڑا۔ سامعین جو اس کے کمالِ فن پر عش عش کرتے تھے اکثر اپنی نشستوں سے اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے اور یہ خوش اخلاق ننھا مغنّی مسلسل اور بے تکان ساز بجاتا رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا اور ایک نغمے کے سُر دوسرے نغمے کے آگے پیچھے ایسے مچلتے تھے جیسے موسم بہار کی پھوار پھولوں پر رقص کناں ہو۔ آخر کار اس کا باپ محفل کے اختتام کا اعلان کرتا۔ فیشن ایبل خواتین اور شرفاء پیار سے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اس پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برساتے۔ مگر اتنی تعریف و توصیف بھی اس بچے کے کردار کی فطری حلاوت و شیرینی میں کمی نہ کر سکی۔

لیکن کامیابی و کامرانی کے بڑھتے ہوئے کارواں کے بانگ درا میں ایک نوائے تلخ اس طرح ابھری گویا آنے والے مصائب سے خبردار کر رہی ہو۔ لیوپولڈ آمدنی کی ایک ایک پائی بیٹھ کر گنتا تھا۔ لیکن جو کچھ آمدنی ہو رہی تھی۔ سفر پر اس سے کہیں زیادہ صرفہ ہو رہا تھا کیونکہ اس دور کی امارت کچھ اتنی

شریف واقع ہوئی تھی کہ وہ تعریف و توصیف کو مال و زر جیسی حقیر چیز سے ملوث کرنا شرافت سے بعید تصوّر کرتی تھی۔ اونچے طبقے کے سامعین قدر افزائی کے طور پر سکّوں کی بجائے نسوار کی ڈبیاں جوتوں کے قیمتی بکل یا اپنی صندوقچیوں میں سے کوئی چھوٹا موٹا زیور نکال کر دیا کرتے تھے۔ پاپا موزارٹ جو دست بوسی کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ ان اشیاء کو بسر و چشم قبول کر لیا کرتا تھا اور پھر رات کے کھانے کا خرچ نکالنے کے لیئے بچوں کو کسی اور جگہ محفل جمانے لے جاتا تھا۔

باپ اپنے بیٹے کا واحد استاد تھا۔ ولف گینگ کبھی سکول نہیں گیا لیکن اسے پڑھائی پر لگانے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ وہ ہر قسم کی تعلیم میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ منہمک ہو جاتا تھا۔ ریاضی سے تو اسے خاص شغف تھا اور وہ اپنے گھر کی میزوں اور دیواروں کو سوالات کے حل سے سیاہ کر دیتا تھا۔ وہ اس علم سے مسحور ہو گیا تھا جو ہمیشہ ایک سوال کا واحد اور قطعی جواب دیتا تھا اور یہی اس کی موسیقی کی کلید ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس کی موسیقی ریاضی معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ ریاضی کی طرح درست، مکمل اور کامل طور پر اطمینان بخش تھی۔ اس کی موسیقی زندہ دلی کے ساتھ ایک نغمے سے دوسرے نغمے تک جھولتی جاتی ہے اور اس کی بنیاد ہمیشہ ایک فطری بے داغ اخلاقی اقدار پر استوار رہتی ہے۔ لیکن بیشتر معلّمینِ اخلاق کے برعکس موزارٹ میں مسرّت و انبساط ہے لطافت و شفقت ہے۔ حوصلہ آفرینی ہے۔ اس کی موسیقی جتنی سماعت میں آسان ہے اتنی ہی شادکام بھی ہے اور اس سہل سماعت کا سبب محض اس کی موسیقی کی نغمگی ہی نہیں بلکہ اس کی ترتیب کی بنیادی اور معجزہ نما صحت ہے

اور اس کی یہی خصوصیت ہمیشہ تمام موسیقاروں کے لیے باعث حیرت رہی۔

ایک معمّر دھن ساز پاپا ہیڈن نے ـــــــ ننھا موزارٹ اسے اسی نام سے پکارا کرتا تھا ـــــــ پاپا موزارٹ سے کہا۔ "تمہارا لڑکا دنیا کا عظیم ترین موسیقار ہے۔" لیکن موزارٹ کے زمانے میں لوگوں نے اس کی کچھ موسیقی کو "ضرورت سے زیادہ جدید اور ضرورت سے زیادہ ترقی پسند" ٹھہرایا۔ مگر آج جب ہمارے کان پہلی بار موزارٹ کے کسی نغمے سے آشنا ہوتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم عمر بھر اس نغمے سے واقف رہے ہیں اور اسے دل سے پسند کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موزارٹ نے اپنے بعد کی موسیقی کو جس سے ہم اچھی طرح آشنا ہیں گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ بیتھووین نے موزارٹ کا مستقل مطالعہ کیا اور ہیڈن نے اپنے کمسن دوست کی نقل کر کے اس کی عزّت افزائی کی۔

شوپن موزارٹ کی موسیقی کی روح میں ڈوبا ہوا تھا اور مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی "میری یاد میں موزارٹ کی دھنیں بجانا" براہمز کے نزدیک موزارٹ ایک "دیو" تھا اور خود سر واگنر تک نے اس کے آگے سر جھکایا۔ وردی کے اوپیرا۔ سٹراس کے طرب خیز والٹز نغمے اور شوبرٹ اور شوماں کے عظیم گیت سب کے سوتے موزارٹ کے سر چشمے سے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔

موزارٹ کا گویا خمیر ہی موسیقی سے اٹھا تھا۔ نغمے اس کے ہونٹوں اور انگلیوں پر تھرکتے تھے۔ سفر خصوصیت کے ساتھ اس کے وجدان کو حرکت میں لاتا تھا اور وہ ڈولتے اور جھونکے کھاتی ہوئی بگھی میں بیٹھا اپنے گھٹنے

پر انگلیوں سے تال دیتا جاتا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ مسرّت سے دمک اٹھتا۔ حتّیٰ کہ دھن اس کے دماغ میں مکمل ہو جاتی اور وہ اسے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کر اسے بگھی کے پٹ میں لگے ہوئے جیب میں اڑس دیتا۔ پندرہ سال کی عمر میں تو وہ سمفنیوں اور آپیراؤں کا مصنف بن چکا تھا۔ جن میں سے بعض امتیازی کامیابی کے ساتھ پیش کیے جا چکے تھے پندرہ سے اکیس سال تک کی عمر میں اس نے دھنوں کی ترتیب کے فنی طور پر سب سے مشکل میدان پر حملہ کیا جس میں قدم دھرنا گویا ماضی کے اساتذہ سے مقابلہ پر اتر آنا تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ وہ استاذ الاساتذہ ہے۔ سال بہ سال اس کے جوہر زمین کی طرف بڑھتے ہوئے کسی نئے ستارے کی طرح روشن تر ہوتے جاتے تھے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اسے موسیقی کے اس بلند ترین منصب پر فائز کیا جانا چاہیے تھا۔ جو اس کا شہنشاہ فرانسیس اوّل والیٔ آسٹریا اسے بخش سکتا تھا۔

لیکن قدر افزائی کی بجائے شہنشاہ کی طرف سے وہ نظر انداز کیا گیا اور معتوب رہا۔ شہنشاہ کے بدطینت حواریوں نے اس کی شہ پا کر اس بے اعتنائی پر یہ بھی اضافہ کیا کہ موزارٹ کی توہین کرنے لگے۔ اس لئے کہ موزارٹ کی قدرتی صلاحیتوں اور خداداد جوہر نے اس وقت کے موسیقاروں میں اس کے خلاف حسد اور خوف پیدا کر دیا تھا۔ حریف مغنیوں نے اس کے فن پاروں کو پیش نہ ہونے دیا یا جب کبھی یہ پیش کیے گئے تو سازندوں کو رشوت دی جاتی تھی کہ وہ نغموں کا حلیہ بگاڑ دیں۔ یہ دوسرے دُھن ساز بھی زمانہ کی ناقدری کا شکار تھے۔ جس کے سبب موزارٹ پر فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔ اس زمانہ میں کاپی رائٹ کا کوئی

ایسا قانون نہ تھا جو ان کی حفاظت کر سکتا۔ ایک بار موسیقی کا کوئی فن پارہ منظر عام پہ آتا تو رائلٹی کے بغیر اسے کوئی بھی جتنی بار چاہے۔ پیش کر سکتا۔ ان کا چربہ اڑا سکتا بلکہ ڈھٹائی سے کام لے کر اسے دوسروں کے کارنامے کے طور پہ پیش کر سکتا تھا۔

کسی دھن ساز کے لیے واحد تحفظ یہی تھا کہ وہ کسی دربار سے متعلق ہو جائے یا کسی امیر آدمی کے رشتۂ ملازمت میں منسلک ہو جاتے۔ موزارٹ کو اس قسم کی ملازمت تو ملی مگر کوئی سو روپے سالانہ کے مشاہرے پہ اس کا آقا آرچ بشپ آف سالزبرگ اسے اپنے اسقفی خانوادے کے باورچیوں اور خدمت گاروں کے ساتھ کھانا دیتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اس کی شدید توہین کر کے وہ اس میں انکساری پیدا کر سکتا ہے اس خدمت سے مستعفی ہو کر موزارٹ ویانا میں ایک آزاد فن کار کے طور پہ جا بسا جہاں وہ واحد نامور موسیقار تھا جسے کوئی ملازمت نہیں دی گئی۔

اس دور کے ویانا کے لوگ بھی آج کے بہت سے لوگوں کی طرح کسی موسیقار کو اس وقت تک فطین نہیں سمجھتے تھے جب تک اس کا نام غیر ملکی نہیں ہوتا تھا۔ موزارٹ کے آپیرا کو سننے کے بعد آسٹریا کے شہنشاہ نے فرمایا" اس میں تو سُروں کی بھرمار ہے عزیز من!" "حضور" شہنشاہ موسیقی نے پوری دلجمعی سے جواب دیا۔ "اس میں اتنے ہی سُر ہیں جتنے کہ ہونے چاہئیں"

جب سرکردہ مغنی گلگ چل بسا تو موزارٹ کو اس کا منصب دیا گیا۔ لیکن گلگ کو جو وظیفہ دیا جاتا تھا اس سے بمشکل نصف پہ موزارٹ کے ذمے محض یہ کام تھا کہ وہ بال روم رقص اور کورچ کے راگوں کا انتظام کرے۔ اس کے باوجود موزارٹ

اس ملازمت کے ملنے پر قانع تھا اس لیے کہ اس نے نو عمری میں جلد بازی سے کام لے کر شادی کر لی تھی —— اور بچوں کے پل ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس کی بیوی کانسٹینز ویبر ایک ایسے خاندان کی چار حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی، جس کا ہر فرد موسیقی کا متوالا تھا۔ ویبر گھرانے میں موزارٹ کا خیر مقدم کیا گیا اور وہ وہاں کئی کئی دن کنبے کے ہر فرد کی طرح رہتا تھا۔ کانسٹینز کو جب پہلی بار موزارٹ نے دیکھا تو وہ تیرہ برس کی ایک الھڑ لڑکی تھی۔ موزارٹ دراصل اس کی بڑی بہن الائے سیا کو نقد دل دے بیٹھا تھا جو ایک پندرہ سالہ سیم تن اور سریلی آواز کی دوشیزہ تھی۔ وہ جب پیرس میں قسمت آزمائی کے لیے گیا تو الائے سیا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے گی لیکن جب وہ پیرس سے ناکام لوٹ آیا تو وہ آپیرا کے سٹیج پر کسی اور کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر چکی تھی۔ کافی عرصہ بعد جب الائے سیا سے کسی نے پوچھا کہ اس نے موزارٹ کے پیام کو کیوں مسترد کر دیا تھا تو الائے سیا نے اعتراف کیا "میرا خیال تھا کہ وہ تو ایک معمولی آدمی ہے۔"

کانسٹینز نے اس دل کے ٹکڑوں کو جمع کیا جسے اس کی بہن توڑ چکی تھی۔ چنانچہ پاپا موزارٹ کا ناقابل معافی غصہ مول لے کر ولف گینگ نے اپنی "سٹینزی" سے شادی کر لی۔ وہ ایک سنہرے بالوں والی خوش گلو کمسن لڑکی تھی جو ویانا کے سبزہ زاروں پر پکنک کے لیے مثالی ہمجولی تو ہو سکتی تھی مگر بیوی کی حیثیت سے اس میں گرہستی کی تمام صلاحیتیں مفقود تھیں۔ اسے کبھی پیسہ برتنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ اسے اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ اس کی بار بار مداخلت سے شوہر کی یکسوئی

برقرار نہیں رہتی۔ موزارٹ حسرت سے یہ دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا کہ اس کی شوخ و شنگ اور کھیل تماشے کی دلدادہ بیوی مفلسی اور آئے دن کے بچوں کی پیدائش کے پاٹوں میں بری طرح پس رہی ہے۔ چنانچہ "ولفی" اپنی بیوی کے لبوں پر طفلانہ مسکراہٹ واپس لانے کے لیے چھوٹے چھوٹے تعیّشات پر قرض دام لے کر روپیہ صرف کرتا تھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ اس کی دھان پان بیوی کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ زچگی کے وقت اسے معمول سے زیادہ تکلیف برداشت کرنا پڑتی تھی اور اس کے بہت سے بچے قبل از وقت موت کی آغوش میں جا چکے تھے اور یہ مصائب تو کسی حوصلہ مند عورت کے پاؤں ڈگمگانے کے لیے کافی تھے۔

ان ناشگفتہ کلیوں کے مرجھا جانے پر نوحہ لکھنے کے لیے کسی اور موسیقار کی خدمات حاصل کر کے موزارٹ اپنی بیوی کے دردِ زِہ کی کراہ اور چیخوں میں بھی دھنیں ترتیب دیتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی موسیقی میں موزارٹ نے اپنی زندگی کے آلام و مصائب اور رنج و غم کی پرچھائیں تک نہ پڑنے دی۔ جوں جوں اس کے حالات خراب ہوتے گئے وہ اپنے فن میں اتنے ہی حوصلے کی آمیزش کرتا چلا گیا اور یہ حوصلہ سنگین نہیں بلکہ چڑیوں کی چہکار کی طرح سبک اور دلنواز ہوتا بلکہ اجرت کی خاطر جو چھوٹا موٹا کام بھی قبول کرنا پڑتا تھا اسے بھی وہ لافانی شہ پاروں میں تبدیل کر دیتا تھا۔

قصائی کا قرضہ چکانے اور بعض دفعہ قرق امین سے پیچھا چھڑانے کے لیے (جو اکثر اس کے پاس آتا اور کوئی نہ کوئی فرنیچر اٹھا لے جاتا) موزارٹ

کنسرٹ پر کنسرٹ منعقد کرتا اور کنسرٹ کے لیے ہمیشہ نئی موسیقی ترتیب دیتا۔ یہ دُھنیں نہایت عجلت میں لکھی جاتی تھیں۔ اس کے بعض عظیم ترین شہ پارے محض چند دنوں کی کاوشش کا نتیجہ ہیں۔ تخلیق کی یہ ناقابلِ یقین قوت محض اس وجہ سے ممکن تھی کہ موزارٹ کا دماغ موسیقی سے لبریز تھا۔ اس کی تکنیک گویا اس کی باندی تھی جو کسی لمحے اس کے ہر اشارے پر معجزے پیش کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی زندگی نے اس کے ذہن کی گہرائیوں کا ساتھ نہ دیا۔ بعض دفعہ تو یہ مسئلہ پیدا ہوتا تھا کہ مشق کرنے کے لیے انگلیوں کو وہ کیسے گرم رکھے۔ ویانا کی برفیلی سردیوں میں، موزارٹ کے کمرے کو حرارت پہنچانے کے لیے بعض اوقات ذرّہ بھر ایندھن میسّر نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک دوست جب ملاقات کی غرض سے آیا تو اس نے دیکھا کہ وُلفی اور سٹینز اپنے آپ کو حرارت پہنچانے کے لیے رقص کر رہے ہیں۔ یہ قصّہ کچھ اس انداز سے سُنایا گیا جیسے یہ دونوں خوش وقتی میں مصروف تھے اور سب کچھ ایک مذاق تھا حالانکہ حقیقت میں یہ بے چارے سردی میں ٹھٹھر کر مرنے کے قریب تھے اور جنون کی سی کیفیت میں رقصِ بسمل کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ دوست بھاگا بھاگا گیا اور ان کے لیے تھوڑا سا ایندھن لے آیا۔

لیکن دنیا کو موزارٹ کے جس دوست کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے وہ ایک ساتھی فری میسن پچبرگ نامی ایک تاجر تھا جو اس موسیقار کی وقتاً فوقتاً چھوٹی موٹی رقوم سے امداد کیا کرتا تھا۔ موزارٹ جو خطوط اپنے دوست سے امداد طلب کرنے کے سلسلہ میں لکھا کرتا تھا۔ ان کو پڑھ کر اس تصوّر ہی سے ہمارا جی جل، اُٹھتا ہے کہ ستم ظریف زمانے نے اس گوہرِ تاباں کو ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج جب سب یہ سنتے ہیں کہ موزارٹ کی موسیقی لاجواب ہے اور وہ ہمارے درمیان نہیں ہے تو یہ کہنا بڑا سہل ہے کہ ہم ہوتے تو موزارٹ کی بڑی قدر کرتے۔ زندگی میں اگر موزارٹ کو کہیں سراہا گیا اور اس کی قدر کی گئی تو پراگ میں۔ اس کے دل کش "آپیرا" فگارو کا بیاہ (THE MARRIAGE OF FIGARO) کا دیانا میں بڑی سرد مہری سے خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن جب اسے اسی آپیرا کو پیش کرنے کے لیے پراگ آنے کی دعوت دی گئی تو موزارٹ نے دیکھا کہ بوہیمیا کے دارالحکومت میں ہر شخص کی زبان پر فگارو کا تذکرہ تھا اور پراگ کے گلی کوچوں میں ہر طرف فگارو کی دھنیں گنگنائی جا رہی تھیں۔ پراگ میں قیام کے دوران اس نے اپنی سُریلی پراگ سمفنی' لکھی اور کچھ عرصہ بعد اس موسیقی کے دلدادہ شہر کے بارے میں ایک خصوصی آپیرا مرتب کرنے کے لیے اسے دوبارہ مدعو کیا گیا۔ وُلف گینگ اور کانسٹینز کے لیے یہ بڑے اچھے دن تھے جب یہ دونوں پہاڑوں کے راستے سے سفر کرتے ہوئے اس قدیم ٹھنڈے قصبے میں پہنچے جہاں موزارٹ نے ڈان گیوِدانی (DON GIO VANNI) پر کام شروع کیا جو اکثر "مکمل آپیرا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس شاعر نے اس غنائی ناٹک کی نغمہ نگاری کی، وہ ایک زندہ دل آوارہ منش بوڑھا تھا جو بعد ازاں امریکہ چلا گیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں اطالوی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔ یہ شاید داپانتے تھا جو ایک تنگ گلی میں موزارٹ کے سامنے ہی رہتا تھا وہ اکثر گھر بیٹھے ہی ایک دوسرے کو آواز دے کر مسوّدہ مانگتے تھے یا ایک دوسرے کو پکارتے کہ آکر چند ورق اور سُن جاؤ۔ کبھی کبھار یہ دونوں اکٹھے گلی میں نکلتے اور ناچتے گاتے مے خانے کا رُخ کرتے تو سارے پراگ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

موزارٹ کے مدّاح ہر جگہ اس جوڑے کی خاطر مدارات کرتے چونکہ وقت کم تھا اس لیے آپیرا کا جب کوئی ٹکڑا مکمل ہو جاتا تو وہ فوراً مغنّی یا مغنّیہ کے پاس دوڑا دوڑا جاتا اور اسے بنفسِ نفیس گانے کی مشق کراتا، تاہم جس روز آپیرا شروع ہوتا تھا اس دن تک بھی اس آپیرا کا دیباچہ نہیں لکھا گیا تھا۔ ہال کی بتّیاں اس وقت روشن ہو چکی تھیں جب سکور جس کی روشنائی ابھی گیلی ہی تھی سازندوں کی میز دل پر پھینکا گیا۔ سازندوں نے بغیر کسی مشق کے اس کی ابھرتی ہوئی تانوں کو صحت کے ساتھ بجایا اور آپیرا کا آغاز کامیابی سے ہوا۔ اس سے قبل کوئی طربیہ ایسے لذّت آفرین اثرات کے ساتھ موسیقی میں کبھی پیش نہیں کیا گیا تھا لیکن ڈان بھی ایک المیہ ہے اور اس میں موزارٹ بلا کے زورِ قلم اور ڈرامائی وجدان کا مالک بن کر ظاہر ہوا ہے۔ مسلسل تالیوں اور فرمائشوں کی تکرار نے تین گھنٹے کی موسیقی کو چھ گھنٹوں تک پھیلا دیا جس کے خاتمے پر تماشائی اس عالم میں گھروں کو لوٹے کہ وہ نغموں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس آپیرا سے جو آمدنی ہوئی اس کی بدولت تھیٹر کا مالک دیوالیہ ہونے سے بچ گیا لیکن موزارٹ کو اس آمدنی سے حقیر ———— بہت ہی حقیر رقم ملی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیڑھ صدی قبل جب سے موزارٹ کے آپیرا اسٹیج پر پیش کیے گئے اس کے بعد سے کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب کہ کہیں نہ کہیں اس کا کوئی نہ کوئی آپیرا تھیٹر کی زینت نہ بنا ہو۔

موزارٹ کی زندگی کا ستارہ جیسے جیسے دائمی تاریکی کی جانب ڈوبتا گیا اس کی رفتار بھی تیز، اور اس کی روشنی پہلے سے کہیں زیادہ خیرہ کُن ہوتی گئی۔ اس کی آخری نو سمفنیاں جن میں سے بعض اس کے حینِ حیات نہیں سنی گئیں بیتھوون

کی نوسمفنیوں کی ہم پلّہ ہیں۔ بعض لوگ موزارٹ کی موسیقی کو ہلکی پھلکی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ وہ صرف اس کے ان نغموں سے واقف ہوتے ہیں جو بچوں کو سکھائے جاتے ہیں لیکن اس کے فن کی گہرائی محسوس کرنے کے لیے پورے پورے نغمے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آخری دور میں بھی یعنی اس کی زندگی کی پینتیسویں بہار کے دوران میں گو وہ بہت بیمار تھا، اس کے باوجود اس نے پریوں کا شہرہ آفاق آپیرا "دی میجک فلوٹ" (THE MAGIC FLUTE) (جادو کی بنسری) لکھا۔ جو ایسے عجیب وغریب نغموں اور علامتوں سے بھرپور تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صرف فری میسن ہی اسے مکمل طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس آپیرا کو باقاعدہ آپیرا ہاؤس میں کوئی جگہ نہ دی گئی۔ لیکن ایک ٹٹ پونجیئے پروڈیوسر نے ایک تنگ وتاریک محلّے کے ایک ٹوٹے پھوٹے تھیٹر میں اس کو پیش کیا۔ اس کی خبر دور دور تک پہنچ گئی اور سارا ویانا اسے سننے کے لیے ٹوٹ پڑا۔ پروڈیوسر نے اس کے ذریعہ اتنا روپیہ کمایا کہ اس نے اس سے ایک مستقل نیا تھیٹر تعمیر کر لیا۔ لیکن موزارٹ ٹائیفائیڈ سے صاحب فراش تھا اور وہ اسے دیکھنے نہ آسکا۔ مگر وہ بستر پر لیٹا لیٹا اپنی گھڑی ہاتھ میں لیے چشم تصوّر سے دیکھتا اور یہ کہتا، "اب پردہ اٹھ رہا ہے اور رات کی رانی اپنا گیت سُنا رہی ہے اب یہ لوگ 'جادو کی بنسری' کی آواز پر شعلوں کے درمیان سے آنچ کھائے بغیر گزر رہے ہیں۔"

موت سے ایک آدھ سال قبل موزارٹ کے پاس ایک اجنبی آیا جو بڑا ترشت رُو تھا اور اس نے موزارٹ کو بتایا کہ اس کے آقا نے اپنی مرحوم بیوی کی یاد میں مردانہ اور زنانہ آوازوں میں ایک نوحہ لکھوانے کا حکم دیا ہے۔ اس نے موزارٹ

کو کچھ رقم پیشگی کے طور پہ ادا کی۔ لیکن کسی حال اس نے اپنے آقا کا نام افشاء نہیں کیا۔ اس کی وجہ جو بعد میں معلوم ہوئی یہ تھی کہ اس شخص کا آقا کاؤنٹ والسیگ خفیہ طور پر موسیقی کے فن پارے لکھوانے اور پھر انہیں اپنے نام سے پیش کرنے کا بڑا شوقین تھا۔

اس فن پارہ کو موزارٹ بہت سی رکاوٹوں کے باعث تیار نہ کر سکا۔ وقفے وقفے سے وہ زشت رُو اجنبی اس کے پاس آتا اور موزارٹ کو یاد دلاتا کہ بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔ جیسے جیسے موزارٹ کی حالت غشی اور ہذیان کی طرف مائل ہوتی گئی۔ موزارٹ یہ تصور کرنے لگا جیسے یہ ایلچی دوسری دنیا سے آیا ہوا ہے اور یہ نوحہ خود اس کے اپنے لیئے لکھا جا رہا ہے۔ شدید بخار کی حالت میں اس نے اسے مکمل کرنے کی کوشش کی۔ موزارٹ کو محض سبک دل موسیقار سمجھنے والے لوگ جب یہ نوحہ سنتے ہیں تو چونک اٹھتے ہیں۔ کیونکہ ہیبت ناک قوت کے ساتھ یہ نوحہ رنج و الم اور لرزہ خیز تاسف کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ انسان کی تمنائے ابدیت کے بعید ترین افق کو چھوتا ہے اور بالآخر ایمان و ایقان کی ایک واضح اور متین لَے پر ختم ہوتا ہے اور یہی موزارٹ کے کردار کی بھی لَے ہے۔ بستر مرگ پر جب اس کے معدودے چند دوست احباب جمع تھے۔ اس کے ہونٹوں نے صورِ اسرافیل کی صورت گری کی کوشش کی جس کی گونج اس نوحے میں شروع سے آخر تک موجود ہے۔ بس یہی چار دوست ایک اڑتے ہوئے طوفان کی تاریکی میں موزارٹ کے جنازے پر دعا کے لیے جمع ہوئے۔ جب یہ لوگ قبرستان کی طرف روانہ ہوئے تو طوفان پھٹ پڑا۔ کڑا کے کی بجلی چمکی، موسلا دھار بارشں ہونے لگی اور ہوا کے

بھکڑ اس تیز رفتار سے چلنے لگے کہ وہ دُہرے ہو ہو گئے۔ اس پر یہ چاروں دوست راستے ہی سے لوٹ گئے اور تابوت کی گاڑی تنہا قبرستان کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک کھلی قبر میں بدمعاشوں، خودکشی کرنے والوں اور طوائفوں کے گلتے ہوئے ڈھانچوں کے درمیان وہ جسد خاکی پھینک دیا گیا۔ جس میں کبھی ایسی نغمہ ریز روح متمکن تھی، جو اس کرۂ ارض پر شاید ہی کسی اور پیکر میں مہمان رہی ہو۔ موزآرٹ کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ کسی کو اس پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے ناانصافی، بیماری قرض، ناامیدی حتیٰ اینکہ موت پر فتح پائی۔ اس نے تمام ذلتوں اور اذیتوں کا جواب اس طرح دیا کہ اس میں زندگی کی جھنکار اب تک باقی ہے۔ وہ شخص جس نے اپنے زمانے کی اذیت کوش دنیا کا مقابلہ گیتوں سے کیا تھا۔ آج بھی ہمیں اپنے زمانے کی دنیا کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے ؛



کیپٹن کُک

سات سمندروں کا سیّاح

یارک شائر کی سڑک پر ایک لڑکا قدم گھسیٹتا چلا جا رہا تھا کہ بادِ شرق کا ایک جھونکا اس کے مقدر کی پہلی نوید لے کر آیا۔ یہ بس ایک ہی گونجتی ہوئی لے تھی۔ مگر معنی سے بھرپور۔ ہوا کی سائیں سائیں کان میں پڑتے ہی وہ سر اٹھا کر غور سے سننے لگا اور پھر اس خشکی کی گود میں پلے ہوئے لڑکے نے، جس نے اب تک اپنی عمر، اپنے آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ مٹی کی جھونپڑی میں گزاری تھی، پہلی بار ایک ٹیلے کی اوٹ سے سمندر کی جھلک دیکھی اور پہلی ہی بار پانی کو افق تک پھیلے ہوئے دیکھا۔ اس نے سمندر کی لہروں کو ان چٹانوں پر سر پٹکتے اور جھاگ اگلتے دیکھا۔ جو جل پریوں کی طرح اپنی سفید زلفوں کو شانہ کرتی ہوئی نیلگوں مسکراتی آنکھوں سے دعوتِ قرب دے رہی تھیں، اور پھر اس نے سمندری گھاس اور سیپیوں وغیرہ سے اٹی ہوئی ڈھلان پر سے ہوتے ہوئے کناروں کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ جہاں ننھی ننھی لہریں

جھاگ کے قلعے اس کی طرف اسس طرح دھکیل رہی تھیں جیسے جہاز بادبان تانے چلے آتے ہیں۔ اس نے سرد لہروں میں ہاتھ ڈالے جیسے وہ اس سے آلو کے ان کھیتوں کی مٹی کا آخری ذرہ تک دھو رہا ہو۔ جہاں اس وقت تک وہ ایک غلام کی طرح کام کرتا تھا اور پھر اسس نے اپنی گیلی انگلیاں ہونٹوں سے لگائیں اور پہلی بار سمندر کا وہ نمکین مزہ چکھا جو اس کا پیدائشی حق تھا۔ ۱۷۴۱ء کے اس روز ملاحوں کی عظیم ترین قوم کے عظیم ترین بحر پیما۔ جیمز کُک نے اپنی نئی محبوبہ سمندر کی دیوی کو پا لیا۔ اسس وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔

اس کا موجودہ آقا سینڈرسن، سٹیتھس نامی گاؤں کا پنساری اور بزاز تھا جو اپنے ملازم پر ہر وقت ہی برہم رہتا تھا۔ کمسن جیمز رات کو دُکان کے کاؤنٹر کے نیچے سو جاتا اور دن میں وہ اسی کاؤنٹر کے پیچھے سکاش اور گمر دن فروخت کیا کرتا تھا، اور بعض دفعہ جب سینڈرسن شراب خانے سے نشہ میں دھت لوٹتا تو اسی کاؤنٹر پر جیمز کو اٹھا کر بید سے بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ جیمز بے چارہ ان تمام مظالم کو جن پر قلیل غذا مستزاد تھی صبر اور خاموشی سے برداشت کرتا رہا، اس لیے کہ یہ گاؤں دھبٹی بندرگاہ سے قریب تھا جہاں جہاز آیا جایا کرتے تھے۔

دھبٹی کوئی ایسی رومانی بندرگاہ نہ تھی جہاں مشرق سے عجیب و غریب تجارتی قافلے اترتے ہوں۔ اس بندرگاہ سے کوئلہ، لوہا اور پتھر، لندن اور بریمن بھیجے جاتے تھے اور ناروے اور بحیرہ بالٹک کے دوسرے ممالک سے وہیل مچھلی کا تیل اور شہتیر آیا کرتے تھے۔ لیکن اس فاقہ کش قدآور، دُبلے پتلے اور مریل لڑکے کے لیے جس کی بھوری آنکھیں ہر وقت دہکتی رہتی تھیں، جہاز دل

اور سمندر سے متعلق کوئی بھی موضوع بے کیف اور اکتا دینے والا نہ تھا، رال اور سن کی رسّی کی مخصوص بُو سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ سمندر کی نمکین ہوا اور جہازیوں کے پائپ کے دھوئیں سے اس کی قوت شامّہ کبھی سیر نہ ہوتی تھی نہ ہی اس کے کان ملّاحوں کی گپ شپ، مرغابیوں اور بچوں کے شور، جہاز کے مستول، بلّے اور رسیاں چڑھانے کی مخصوص چوں چوں، بادبانوں کی پھڑپھڑاہٹ اور لنگر کی کھڑکھڑاہٹ سے تھکتے تھے۔ اس لیے جہاز کا خاکہ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا۔ دھبٹی بندرگاہ کی کشید کی ہوئی شراب پی کر نشے میں وہ اتنا مست ہو گیا جتنا سینڈرسن تاڑی پی کر مست ہو جاتا تھا۔ آخر ایک رات درندہ صفت آقا شراب میں بدمست ہاتھ میں چھڑی لیے دکان کے گوشے گوشے میں اسے تلاش کرتا پھرا لیکن بے سُود۔ جیمز کک جا چکا تھا ——— اس کی منزل سمندر تھی۔

اس کے پہلے جہاز کا نام بڑا رومانی تھا یعنی "آزاد محبت" (FREE LOVE) لیکن یہ بس کوئلہ ڈھونڈنے والی ایک بھدّی، مضبوط، سست رفتار لیکن قابل اعتماد کشتی تھی۔ اس کشتی کے کیبن لڑکے کو بیک وقت کئی فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔ یہاں جیمز کی زندگی اتنی ہی گھٹن تھی جتنی اس ظالم اور شرابی بزاز کے ہاں تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ بات بات پہ اس کے کوڑے پڑتے تھے اور خوراک تو پہلے سے بھی خراب ملتی تھی۔ تاہم کشتی میں جیمز کک کو اس کی نوعمری کے باوجود جوان آدمیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور وہ بھی اپنے آپ کو ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ سرما میں جب کشتی کنارے پر لگا دی گئی تو اسے اس بیڑے کے مالکوں میں سے ایک کے مکان پر ٹھہرایا گیا۔ یہ لوگ کویکر فرقہ

سے تعلق رکھتے تھے اور اخلاق، مذہب اور تجارت کے بارے میں ان کے اصول بڑے سخت تھے۔ غالباً انہی کی فیض صحبت کا اثر تھا کہ جیمز کک نے بڑی حد تک وہ نظم و ضبط، وہ شائستگی اور دیانت داری سیکھی جو بعد میں اس کی زندگی کی نمایاں خصوصیت بن کر ظاہر ہوئی۔ وہ کیبن بوائے سے ترقی کر کے پہلے تو عرشہ کے مددگاروں میں شامل ہوا۔ پھر میٹ بنا اور بالآخر ماسٹر بن گیا۔ اس طرح جہازیوں کی اصطلاح میں وہ زینہ پکڑ کے کیبن میں پہنچا۔ جہاز کی کٹھن زندگی نے اسے کچھ اتنا جفاکش بنا دیا تھا کہ وہ ہر چیز کھا سکتا اور ہر موسم کی سختی برداشت کر سکتا تھا تاہم اس جفاکشی نے نہ اس کے دل کو سخت کیا تھا۔ نہ اس کے ذہن کو کند، وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ ریاضی، علم ہیئت، جغرافیہ وغیرہ —— اُسے کہیں سے اقلیدس کا ایک نسخہ ہاتھ لگا تو اس نے اپنے آپ علم ہندسہ (جیومیٹری) سیکھ لیا اور انسانوں کا تو وہ ہمیشہ ہی گہرا مطالعہ کرتا رہتا تھا تا آنکہ اس نے نہ صرف حکم کی تعمیل کرنا سیکھ لیا بلکہ یہ بھی کہ دوسروں سے حکم کیسے منوایا جائے اور پھر ۱۷۵۵ء میں ایک دن جب انگلستان اور فرانس میں تازہ تازہ جنگ چھڑی تھی۔ لندن کی گودی پر اس نے جبری بھرتی کرنے والوں کے دستے دیکھے جو گلی گلی گھوم کر تجارتی جہازوں کے ملاحوں کو پکڑ کر جنگی جہازوں میں ان سے کام لینے کے لیے بھرتی کر رہے تھے۔ ان دنوں کسی جنگی جہاز پر زندگی جہنم بر آب سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ کک کے دل میں پہلی بات یہ آئی کہ وہ روپوش ہو جائے لیکن اس کی بجائے فیصلہ اس نے وہ کیا، جس سے نہ صرف اس کی زندگی بلکہ دنیا کی تاریخ کے دھارے کا رُخ مڑ گیا اور دنیا کے نقشے کی شکل بدل کر رہ گئی۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے شاہ جارج کی خدمت

کے لیئے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا۔

بالکل ابتدائی خدمت سے دوبارہ آغاز کرتے ہوئے وہ محض اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ترقی کے مدارج طے کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جنگ ہفت سالہ کے چار سال جب گزر گئے تو ایک مستول والی کشتی مرکوری کی کمان اس کی تحویل میں دی گئی اور کیوبک کے محاصرے پر روانہ کر دیا گیا اس کے ذمے پہلا کام یہ تھا کہ فرانسیسی توپوں کی عین زد میں پہنچ کر دریائے سنٹ لارنس کی گہرائی ناپے اور اس نے یہ کام رات کی تاریکی میں انجام دیا۔ وہ بمشکل اپنا کام ختم کر پایا تھا کہ اس پر حملہ کیا گیا۔ اور سرخ ہندیوں نے ڈونگوں میں اس کا تعاقب کیا۔ یہ سرخ ہندی جہاز کے دنبالے پر چڑھنے لگے تھے کہ خوش قسمتی سے جہاز کا اگلا حصہ بحفاظت کنارے لگ گیا۔ اور کک چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا۔

خدا خدا کر کے ۱۷۶۲ء میں امن قائم ہوا اور جیمز کک جس کی عمر اس وقت ۳۴ سال تھی بحر الفت کی غواصی کرنے لگا۔ اسی سال اُس نے شادی کر لی۔ لیکن اس کی الزبتھ بحریہ کے دوسرے ملاحوں کی بیویوں کی طرح اپنے شوہر کے ساتھ بہت کم وقت گزار سکی۔ کیونکہ کک کی باقی زندگی زیادہ تر سمندر میں گزری۔ ایک بیوی کی حیثیت سے وہ فکر و تردد کا بوجھ اٹھاتی، تنہائی جھیلتی اور بچوں کی پرورش و نگہداشت میں مصروف رہتی تھی اور مشقتیں اور فتح و نصرت جیمز کے حصے میں آئیں، ماہرین فلکیات کے حسابات کی رُو سے اس سال ۳ جون کو زہرہ سیارہ قرص آفتاب پر سے گزرنے والا تھا اور ایسا قران ایک صدی میں صرف ایک بار ہی ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کے لیے دنیا کے مختلف حصوں سے

اس کا مشاہدہ کرنا ضروری تھا کیونکہ مختلف عرض بلد سے وقت کو شمار کرنے کے بعد قاعدہ تثلیث کے ذریعہ زمین سے سورج تک کا فاصلہ معلوم کرنا ممکن تھا اس لیے سینٹ پیٹرز برگ سے فلاڈلفیا تک تمام سائنس دان اس ساعت کے لیے چشم براہ تھے۔

لیکن کرّۂ ارض کی مخالف سمت سے بہت کم رپورٹیں آ سکتی تھیں اور جنوبی نصف کرّے کے وسیع رقبے سے کسی اطلاع کی توقع نہ تھی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں کرّۂ ارض کے اس چوتھائی حصّے کی پیمائش تک نہیں کی گئی تھی۔ یورپین جغرافیہ دانوں کا زیادہ سے زیادہ قیاس یہ تھا کہ یہ وسیع کرۂ ارض یا تو محض سمندر ہی سمندر ہوگا جس میں شاید ایک بھی جزیرہ نہ ہو، یا پھر ممکن ہے کہ اس میں ایشیا جتنا بڑا کوئی براعظم ہی ہو۔ نہ صرف بحرالکاہل کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں بلکہ زیادہ تر بحری سیاح وہی قدیم راستے اختیار کرتے تھے — جس راستے سے ہسپانیہ کے زروجواہر سے لدے ہوئے جہاز فلپائن سے میکسیکو جایا کرتے تھے اور اس راستے سے گزرنے والے جہاز سوئے اتفاق سے کسی بندرگاہ کو بھی نہیں چھوتے تھے۔ آسٹریلیا کے بارے میں بھی کوئی اطمینان بخش علم نہ تھا۔ نیوگنی پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ تسمانیہ اور نیوزی لینڈ محض دُور سے دیکھے گئے تھے۔ جاوا کے مشرق اور جنوب کی طرف چلّی سے مغرب اور شمال کی جانب کیلی فورنیا اور جاپان اور الاسکا اور قطب جنوبی کے مابین دنیا کے نصف حصے پر گمنامی کا تاریک نقاب پڑا ہوا تھا۔ آخرکار بحریہ نے بحرپیمائی اور فلکیاتی مشاہدات کی غرض سے جنوبی سمندروں کی ایک مہم پر روانہ ہونے

کے لیے جیمز کک کا انتخاب کیا۔ اس مہم کا انتظام رائل سوسائٹی کے ذمہ تھا جو ایک طرح کی قومی تحقیقاتی مجلس تھی۔ کک کا انتخاب کچھ تو اس وجہ سے کیا گیا کہ اس نے کچھ ہی عرصہ قبل سورج گہن پر ایک بڑی جامع اور تفصیلی رپورٹ پیش کی تھی اور کچھ اس لیے کہ اس نے نیوفاؤنڈلینڈ کے ناہموار ساحل کے سروے اور سمندر کی پیمائش کے بارے میں رپورٹ پیش کی تھی مگر ان سب سے بڑھ کر اس کے کردار کے پیش نظر کک کو منتخب کیا گیا۔ شاندار جسمانی بناوٹ اور چھ فٹ سے کچھ نکلتے ہوئے قد کے ساتھ وہ ایک باوقار شخصیت کا مالک تھا اور اس میں جو تمکنت تھی وہ پندار کی وجہ سے نہیں بلکہ روحانی قوت کی بدولت ابھرتی تھی۔ اس پر مستزاد دُور دراز کا سفر کر کے حقائق کی چھان بین کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا، چنانچہ امارت بحریہ سے اس کے نام جو ہدایات وصول ہوئیں وہ اس کی خواہش اور پسند کے عین مطابق تھیں۔ پہلے تو اسے جزیرہ تاہیتی سے (یہ جزیرہ اس وقت بحر جنوبی کے گنے چنے دریافت شدہ جزائر میں سے ایک تھا) فلکیاتی مشاہدات کرنا تھے۔ اور یہاں سے اسے شاہ جارج کی شان و شوکت کو دوبالا کرنے سلطنت برطانیہ کے حدود وسیع کرنے اور برطانوی تجارت کو پھیلانے کی غرض سے نئے مقامات کی تلاش میں آگے بڑھنا تھا، ایک اچھے انگریز کی حیثیت سے جیمز کک نے اس فن کی ذمہ داریاں بکمال مسرت قبول کر لیں۔ لیکن خالص علمی نقطۂ نظر سے اس نے اور آگے بڑھنے اور اپنے فرائض منصوبہ سے کہیں زیادہ کارنامہ سرانجام دینے کا تہیہ کیا اور اسے پورا کر دکھایا۔ سمندر میں اس کا زیادہ وقت دیومالائی علاقوں اور خشکی اور برف سے گزرنے والے افسانوی راستوں

کو غلط ثابت کرنے میں گزرا جن سے اس زمانے کے غلط سلط نقشے بھرے پڑے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی تاریخ میں اب تک جتنے بھی تجارتی یا سیاسی مہم پسندوں نے دریافتیں کی تھیں۔ کُک نے ان سب کی بہ نسبت کہیں زیادہ صحیح سمندری راستے اور خطہ ہائے ارض دریافت کیے۔

کُک کو لفٹیننٹ کمانڈر کا درجہ دیا گیا اور اسے اس کی آزادی دے دی گئی کہ وہ اپنے تاریخی سفر کے لیے جو جہاز مناسب سمجھے منتخب کر لے۔ اس نے جس جہاز کا انتخاب کیا وہ نہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تیز رو اور پُر وقار جہازوں جیسا تھا اور نہ ہی بلند سر عرشی جیسا۔ جس کی بھاری بھرکم توپیں وحشی قبائل کو خوفزدہ کر سکیں۔ اس نے انتخاب کیا تو ایک کوئلہ ڈھونے والی کشتی کا، جو وِھٹبی کی بنی ہوئی تھی کیونکہ ایسی کشتیوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ یہ کشتی عرض میں چوڑی، پیشانی پر گول، پیندے میں چپٹی اور روانی میں سُست تھی۔ لیکن کُک یہ جانتا تھا کہ اس مہم میں وقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اہمیت اس کی تھی۔ کہ سامان رکھنے کے لیے کافی جگہ اور گنجائش ہو۔ ایسی کشتی اتھلے پانیوں میں بھی چلائی جا سکتی تھی اور گہرے پیندے والے جہازوں میں یہ بات ناممکن تھی۔ اگر زمین سے لگ جائے تو یہ کروٹ نہیں لیتی تھی۔ اگر اس میں مرمت کی ضرورت ہو تو اسے کنارے پر کھینچنا آسان تھا۔ یہ اوسط رفتار کی کشتی جسے کُک نے اینڈی ور (ENDEAVOUR) کا نیا نام دیا تھا۔ ۳۶۸ ٹن وزنی اور ۹۷ فٹ لانبی تھی۔ اس میں صرف اس حد تک ردّ و بدل کیا گیا تھا کہ اس کے بادبانوں کی طرز بڑے جہازوں کی سی بنا دی گئی تھی۔ زمانے نے بعد ازاں کُک کے اس انتخاب کی دِل

کھول کر داد دی۔ اس کے بعد سے بحر منجمد شمالی کی مہمات کے لیے تمام کشتیاں اینڈی ور کی طرح سادہ اور پائیدار بنائی گئیں۔ یہاں تک کہ امیر البحر برڈ کی "سٹی آف نیویارک" بھی اینڈی ور ہی کی بہن معلوم ہوتی ہے۔

۲۶ جولائی ۱۷۶۸ء کو یہ کشتی پلائی متھ انگلینڈ سے روانہ ہوئی۔ اس میں چوراسی افراد سوار تھے جن میں دو افسر بھی شامل تھے جو اس سے قبل تاہیتی کا سفر کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ چند ذہین سائنس دانوں کی ایک جماعت بھی سوار تھی۔ رائل سوسائٹی کے ماہر فلکیات مسٹر گرین کے علاوہ ایک مالدار صاحب سر جوزف بینکس بھی شامل تھے۔ جنہیں سائنسی اشیاء ذخیرہ کرنے کا شوق تھا۔ ان کے ساتھ سیکرٹری اور مصوروں کا ایک عملہ بھی تھا۔ ان کے علاوہ مشہور ماہر نباتات ڈاکٹر سولینڈر بھی سوار تھے جو خود لینائے کے شاگرد تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ تاریخ طبعی کا ایک پورا کتب خانہ اور نمونے جمع کرنے اور ان کا مشاہدہ کرنے کے آلات بھی تھے۔ اس طرح اینڈی ور سب سے پہلا اور عظیم سمندری سائنٹیفک مہم جُو جہاز تھا۔ جو یقیناً ان جہازوں سے کہیں بہتر ساز و سامان سے لیس تھا۔ جن پر ہکسلے اور ڈارون نے دنیا کے گرد سفر کیا تھا۔ لیکن اس کشتی پر سب سے باکمال اور دلچسپ شخصیت خود کک کی تھی اس کے چہرے کے نقوش سادہ بلکہ کسی حد تک چپٹے تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ ان میں کم سے کم موا ایلے یا ڈریک کی سی نوابیت کی جھلک نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں مقصدیت کی تیز چمک سے ہر وقت دمکتی رہتی تھیں۔ اس کے بال اس زمانے کے فیشن کے مطابق سادے اور عام ملاح اور وکلاء کی طرز کے بین بین صاف ستھرے اور بے نمود تھے۔ البتہ اس کی گھنی بھنویں اس کے کردار میں کسی حد تک

تُندی کی غمّازی کرتی تھیں۔ اس تندی کا سبب اس کی زیرِ کمان تمام مسافروں کی صحت اور زندگی کا فکر اور تعلق خاطر تھا۔

جیسے جیسے یہ کشتی دہشت ناک راس ہارن کے گرد چکر کاٹتی ہوئی شمال مغرب کی طرف روانہ ہوئی اور یکہ و تنہا روز بروز نامعلوم سمندروں میں بڑھتی گئی۔ اس کے کپتان نے اپنے عملے کی خبر گیری میں اس قدر احتیاط برتنی شروع کی کہ سب پریشان ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کپتان کے منصب پر کُک سے زیادہ معقول شخص کبھی فائز نہیں ہوا تھا۔ اس کو اتنا غصہ دلانا بہت مشکل تھا کہ وہ ملاحوں کو کوڑوں کی سزا دے جو اس زمانے میں بحریہ میں عام تھی، اور جب کبھی وہ یہ سزا دیتا بھی تو نرمی سے۔ گو جہاز پر ایک سرجن ساتھ تھا تاہم کُک اپنے طور پر ملاحوں کا طبی معائنہ کیا کرتا اور شفیق ماں کی طرح بیماروں کی خبر گیری کرتا، اور جہاز کے گندے کونوں کھدروں میں اسی جذبہ کے ساتھ جاتا جیسے کوئی نئی نویلی دُلہن اپنا گھر سنوار رہی ہے۔ لیکن ملاحوں کو غصہ اس بات پر آیا کہ اس نے انہیں ہر ہفتہ پانچ سیر پیاز کھانے پر مجبور کیا اور اس نے انہیں ساس فرانس کی چائے اور رائی خوب ٹھونس ٹھونس کر کھلائی جو خرانٹ ملاح نمکین گوشت، دلیہ اور روٹی پر بدبودار مکھن پھیلا کر کھایا کرتے تھے اور ہر روز ایک گیلن بیئر سے اس خوراک کو حلق سے نیچے اتارا کرتے تھے انہیں اب اتنی شکنجبین اور اتنا گوبھی کا اچار کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا کہ بالآخر ان میں سے بعض نے عذر مچا دیا اور پھر ایسے موقع پر نوشاخہ چابک زنّاٹے میں آتا

تو پھر کیا دُور اندیش کپتان غذا کے معاملے میں خبطی تھا؟ خبطی

ایک ایسے شخص کے لیے بڑا گھٹیا لفظ ہوگا جو بڑی بہادری کے ساتھ طب کے ایک ایسے میدان میں سفر کر رہا تھا۔ جس کے بارے میں اس وقت کچھ بھی چھان بین نہیں کی گئی تھی۔ مگر آج اسی میدان سے ہمیں صحت کے بنیادی اصول ملے ہیں۔ اس زمانے میں خارش کا مرض ملاحوں کے لیے قزاقوں، پتھریلے ساحلوں اور طوفان سے زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوتا تھا۔ خارش کا مریض پہلے تو بڑی کمزوری محسوس کرتا ہے جس کے ساتھ ہی اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں دھنس جاتی ہیں۔ اس کے دانت جڑیں چھوڑ دیتے ہیں اور وہ چلتی پھرتی لاش دکھائی دیتا ہے۔ اندر ہی اندر عضلات اور اعضائے رئیسہ سے خون رسنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور پھر وہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ لنگ کے زمانے سے پہلے اس خوف ناک مرض کا کوئی انسدادی علاج اس کے سوا معلوم نہ تھا کہ غذا میں تازہ پھل اور سبزیاں کھلائی جائیں۔ لیکن تازہ پھل اور سبزیاں سرد خانے کی ایجاد سے قبل طویل سفر پر سمندر کے وسط میں بھلا کس طرح فراہم کی جا سکتی تھیں!

لنگ کا خیال تھا کہ اس مشکل کا اس کے پاس حل موجود ہے۔ آج ہمیں یہ معلوم ہے کہ خارش "حیاتین ج" کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ لنگ کو اس محافظ زندگی (حیاتین) کا علم نہ تھا۔ اس کے باوجود جبلی طور پر وہ اس سے آشنا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بحریہ کے ادنیٰ افسر سے لے کر امیر البحر تک ہر ایک کو یہ توقع ہوتی تھی کہ اتنے طویل سفر میں بیسیوں جانیں ضائع ہو جائیں گی اور اس طرح عملہ کی کارکردگی میں ایسے وقت بھی نوّے فی صد کمی ہو جائے گی! جب کہ جہاز پر ہوا!

کے جھگڑوں یا دشمنوں کا حملہ ہو۔ اس زمانے میں جیمز کک نے جہاز میں پوشیدہ دشمن خارش سے جنگ کرنے کا تہیّہ کیا اور اس جنگ میں غور و فکر اور تجربہ اس کا ہتھیار تھا۔ آج ہم کہتے ہیں کہ جوش کرنے سے 'حیاتین ج' ضائع ہو جاتے ہیں۔ تاہم کُک کو اس وقت معلوم تھا کہ غذا میں خارش کا علاج کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ چولھے کی آنچ کی نذر ہو جاتی ہے۔ اسے اس کا بھی علم تھا کہ پودوں کے بعض خاندان جیسے ترش رس والے سٹیرس پھل اور رائی میں مانع خارش خاصیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اور یہ خاصیت اس نے اپنے عملے کے لوگوں کو سکنجبین اور گوبھی کے اچار کی صورت میں فراہم کی۔ جن کو نہ پکانے کی ضرورت تھی نہ تازہ رکھنے کی حاجت، اگر یہ تدبیر کارگر ہو گئی تو گویا یہ اصل مسئلہ کا حل تھا صرف وقت یا شاید موت اس بارے میں قطعی فیصلے صادر کر سکتی تھی۔

۱۳ راپریل ۱۷۶۹ء کو سمندر کی خالی وسعتوں کو تریاسی دن کے سفر میں عبور کرنے کے بعد اینڈی ور تاہیتی میں لنگرانداز ہوا۔ یہ جزیرہ گویا ملاحوں کی جنت تھا۔ سایہ دار پام کے جھنڈ اور مہمان نواز لڑکیاں، چہچہاتے پرندے، اور مہک دار پھول، بھنے ہوئے گوشت کی ڈشیں اور شیریں پھل، اس جزیرہ کے نرم دل انسانوں سے تو معاندانہ روّیہ کا بہت کم خطرہ تھا۔ البتہ اس کا اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں ملّاح بغاوت کر کے اس جزیرے کو چھوڑنے سے انکار نہ کر دیں۔ اس کا بھی خطرہ تھا کہ ملّاح کہیں اس جزیرے کے سیدھے سادے لوگوں کی مہمان نوازی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ چنانچہ کک نے فوراً ہی انتہائی کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔ ان قواعد کی خلاف ورزی صرف دو آدمیوں نے کی جنہیں اس نے

عبرت ناک سزائیں دیں۔

جزیرے کے مقامی باشندوں سے اپنے تعلقات کے سلسلے میں کُک نے مردوں کے بارے میں تو انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا ہی، لیکن عورتوں کے معاملے میں بھی اس کا طرزِ عمل وہ تھا جو اس زمانے کے سپاہی پیشہ لوگوں میں مفقود تھا۔ اس لیے کہ اسے فوراً ہی احساس پیدا ہوگیا کہ تاہیتی کے باشندوں کی فطرت بھی اتنی ہی متنوّع اور بوقلموں تھی جتنی سفید فاموں کی فطرت، بعض بھلے مانس تھے تو بعض کمینے، بعض دیانت دار تھے تو بعض بد دیانت، بعض عورتیں باعصمت تھیں اور بعض عصمت باختہ، بعض امن پسند تھے اور بعض ہمہ وقت دنگے فساد پر آمادہ۔ جب تصادم کی نوبت آتی تو وہ پرندے شکار کرنے کے چھرّے استعمال کرتا۔ جس سے سزا تو ملتی لیکن آدمی ہلاک نہیں ہوتا۔ چوروں کا اس نے یہ علاج کیا کہ ان کا سر منڈا کر چھوڑ دیتا تاکہ وہ اپنے ہی لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنیں۔ جب والدین کی طرف سے اظہارِ ممنونیت کے طور پر اسے لڑکیاں پیش کی جاتیں تو دوشیزاؤں سے دست کش ہونے سے کہیں زیادہ مشکل ان کے بزرگوں کو مطمئن کرنے کا کام تھا۔ لیکن کسی خود نمائی کے بغیر اس نے صنفِ مخالف سے بے غرضانہ تعلقات کی مثال قائم کردی۔ اس نے ملّاحوں اور جزیرے کے باشندوں کو یہ بات سمجھائی کہ وہ اس جزیرے میں چھُٹّی منانے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے آنے کا مقصد ایک فلکیاتی وقوعہ کا مشاہدہ کرنا تھا۔ چنانچہ جزیرے کے مقامی باشندوں نے اسے ایک "سیّارے کا متلاشی" کا خطاب دیا۔ ملّاح اسے 'فوق البشر' کہتے تھے۔ بہرحال تاہیتیوں کے ساتھ اس کے شریفانہ

طرزِ عمل کی بنا پر یہ جزیرہ اس کی ساری مہمات کے دوران رسد کی فراہمی کا ادارہ بن گیا۔ جہاں سے وہ اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا۔ اور جب اس کے آدمی تھک جاتے تو وہ آرام کے لیے بھی یہیں لنگر انداز ہوتا تھا۔

جب مریخ اور قرصِ شمس کے قران کا کامیابی سے مشاہدہ کیا جا چکا تو جہاز کو کھانے پینے کے ذخیروں سے دوبارہ لاد کر کک جنوب مغربی سمت روانہ ہوا تاکہ اس پُراسرار برِّ اعظم کا پتہ چلایا جائے۔ جس کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ اسی سمت کہیں نہ کہیں واقع ہے۔ اس کا پہلا پڑاؤ نیوزی لینڈ میں تھا جس کے دو حصّوں کے درمیان کی انتہائی تنگ آبنائے کو عبور کرکے اس نے یہ ثابت کیا کہ یہ ایک نہیں دو جزیروں پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ اس نے آٹھ کے ہندسے کی شکل میں دونوں جزائر کے گرد پورا چکر لگایا۔ اس طرح اس نے ۲۴۰۰ میل کے ساحلی علاقے کا ایسا درست نقشہ تیار کیا جو اس کے بعد کے آنے والوں کے لیے ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔

دوبارہ جنوب مغربی جانب مڑکر وہ تسمانیہ کی تلاش میں نکلا مگر اسے تو نہ پا سکا البتہ آسٹریلیا کے جنوب مشرقی ساحل جا پہنچا۔ جس کے وجود کا پہلے علم نہ تھا۔ جب جہاز کو حفاظت سے لنگر انداز کیا جا چکا تو ماہر نباتات ساحل پر اُتر پڑے اور انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ وہاں کا ہر پودا سائنس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جہاز پر ان نئے پودوں کے نمونے لائے، اور ان پر ایسے نادر انکشافات ہوئے کہ کک نے اس کا نام خلیج نباتات (باٹنی بے) رکھ دیا۔ بہت جلد کنگروؤں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور آسٹریلیا کے ان جھولی دار

دودھ پلانے والے جانوروں کا پتہ چلا جو درختوں پر رہتے ہیں۔ بالآخر آسٹریلیا کے سیہ فام جنگلی بھی اسے ملے۔ جنھوں نے اس کے سامنے معاندانہ سکوت اختیار کیئے رکھا اور انتہائی للچا دینے والے تحائف بھی قبول کرنے سے انکار کیا۔

یہ جو نیا خطّہ ارض اسے ملا تھا۔ اس کا کُل رقبہ معلوم کرنے کے لیے وہ آسٹریلیا کے ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت اسے اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ یہ علاقہ جہاں نہ کوئی روشنی کا مینار تھا نہ لنگر نما اور نہ جس کا کوئی نقشہ موجود تھا۔ یہ دنیا کے خطرناک ترین سمندری علاقوں میں سے ایک ہے۔ لیکن گو اس نے بہت جلد یہ بات خود ہی معلوم کر لی، تاہم وہ اس سے خوف زدہ نہ ہوا۔ گریٹ بیریئر ریف (مرجانی چٹانوں کی ایک دیوار) منہ پھاڑے خوف ناک دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ اسے بھی انہی دانتوں کے بیچ سے گزرنا تھا۔ ولندیزیوں کی ایک صدی کی مہم جوئی اور بیسیوں جہازوں کی تباہی کے بعد لوگوں کو آسٹریلیا کے مقابلتاً محفوظ مغربی ساحلی راستے کا دھندلا سا اندازہ ہوا۔ لیکن ایک چھوٹی سی کوئلہ ڈھونے والی کشتی نے پانچ مہینے میں اس خطرناک مشرقی ساحل کے چپّے چپّے کا نقشہ تیار کر لیا۔ بار بار یہ کشتی تباہی کے آغوش میں جا پہنچتی تھی۔ ایک بار تو بلاشبہ یہ ٹکرا ہی گئی اور اس کے اندر اس تیز رفتار سے پانی گھس آیا جو پمپ سے پانی خارج کرنے کی رفتار سے بھی زیادہ تھا۔ ادھر ساحل پر جنگلی قبائل دھوئیں کے اشاروں کے ذریعہ اپنے جنگجوؤں کو امداد کے لیے اکٹھا کر رہے تھے تاکہ ساحل پر اترنے والوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اس کے باوجود کُک کی جہازرانی کی بے مثال مہارت نے ہر بار اینڈیور کو تباہی سے بچایا۔

بالآخر ۱۹ اگست ۱۷۷۰ء کو کُک نے آسٹریلیا کے شمال مشرقی کونے کے گرد چکر مکمل کیا۔ اور شمشیر اور پرچم کے ذریعہ بادشاہ کے نام پہ اپنے دریافت شدہ نئے برّ اعظم کا اعلان کیا۔ ملکِ معظّم کے جام صحت پیئے گئے۔ اور رسم کے مطابق خالی جاموں کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد کُک نے وطن کا رُخ کیا اور راستے میں نیوگنی کے طویل جنوبی ساحل کا جائزہ بھی لیتا گیا۔ جب وہ ولندیزی شرق الہند میں لنگر انداز ہوا تو اس کا دل فخر و مباہات کے جذبے سے معمور تھا۔ اس لیئے کہ اس کا کوئی مسافر نہ تو خارش کی نذر ہوا تھا، نہ ہی کسی ملّاح نے کوئی دن کمرۂ علالت میں گزارا تھا۔ جونہی یہ جہاز ایک متمدّن بندرگاہ میں ٹھہرا اور اس کے ملّاح ساحل پہ اتر پڑے۔ وہ اپنے ساتھ پیچش، ٹائیفائیڈ، ملیریا، غرض ان تمام بیماریوں کے جراثیم لے آتے جو سادہ لوح ملّاحوں کے منتظر رہتے ہیں۔

۱۲ جولائی ۱۷۷۱ء کو دو سال، نو ماہ اور چودہ دن کے طویل بحری سفر کے بعد "اینڈی ور" انگلستان پہنچا۔ امارت بحریہ کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کُک نے بڑے انکسار کے ساتھ یہ توقع ظاہر کی کہ اس کے روزنامچے ان مقامات کے بارے میں معقول مواد و معلومات فراہم کریں گے جن کی وضاحت میں وہ لکھے گئے ہیں۔ اور یہ کہ ہم نے جو انکشافات کیے ہیں، گو وہ کچھ ایسے عظیم نہیں ہیں تاہم ہمارے طویل سفر کا کچھ نہ کچھ جواز پیش کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ کُک نے تاج برطانیہ میں دو قیمتی ہیروں کا اضافہ کیا تھا۔ ایک آسٹریلیا اور دوسرا نیوزی لینڈ، اس نے دُنیا کے بعض خطرناک اور تباہی خیز سمندروں کی بحر نوردی کر کے ان کے نقشے تیار کیے تھے۔ اس نے خارش کے خلاف اپنی خوش تدبیری سے تیر بہدف

علاج معلوم کیا تھا جس کی بدولت نپولین کے خلاف جنگوں میں ہلاک ہونے والے انگریز سپاہیوں سے کہیں زیادہ تعداد میں انگریز ملّاحوں کی جانیں بچ گئیں۔ اور اس نے اپنے سفر نامے کی جو روئداد لکھی تھی وہ بحر پیمائی کی ادب عالیہ شمار ہوتی ہے۔ کُک کے پہلے سفر کے انکشافات سے متاثر ہو کر امارت بحریہ نے سنہ ۱۷۷۳ء میں اسے دوسری مہم پر بھیجا تا کہ وہ جنوبی بحر الکاہل میں اس وسیع بر اعظم کی تلاش کرے جس کے بارے میں اس وقت لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ خطّہٗ ارض انتہائی جنوب میں کہیں نہ کہیں واقع ہے۔ اس بار کُک کے پاس دو جہاز تھے، ریزولیوشن اور اڈونچر یہ دونوں جہاز گرم و سرد چشیدہ اینڈی ور سے ملتے جلتے تھے۔ ان دونوں جہازوں نے جو کبھی ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے اور کبھی ہفتوں اور مہینوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے۔ قطب جنوبی کے سمندروں میں بیس ہزار سنسان ترین فرسنگ کی بحر پیمائی کی۔ کُک نے پہلی بار دائرہ قطب جنوبی کو جنوری سنہ ۱۷۷۳ء میں عبور کیا۔ جب کہ وہاں موسم گرما تھا۔ حتیٰ کہ وہ ۲۱ درجے ۱۰ دقیقے جنوبی عرض بلد تک بڑھتا چلا گیا جو اس وقت تک جنوب میں انسان کی رسائی کی حد تھی۔ گاہے اپنے جہاز کے چوبی مہرہ کو برف کے مہیب انباروں میں گھساتے ہوئے گاہے برف کے تیرتے ہوئے تودوں سے بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے کُک نے تاریخ میں پہلی بار قطب جنوبی کی برف پوش چوٹی کے گرد چکر کاٹا۔ گویا اس کے سفر کی پرکار جنوبی افریقہ کی راس امید سے شروع ہو کر بحر ہند اور جنوبی بحر الکاہل کے راستے راس ہارن سے گزرتی ہوئی اور جنوبی بحر اوقیانوس کو

دائرے میں سمٹتی ہوئی دوبارہ راس امید پہنچ گئی۔ ان برفیلے پہاڑوں کے اُس پار جو ساحل سے جھالر کی طرح ٹنکے ہوتے ہیں براعظم قطب جنوبی پھیلا ہوا تھا جس پر کک کی نظر تو نہیں پڑی لیکن جس کے وجود کے بارے میں اس نے امکان ظاہر کیا تھا اس سفر کے ذریعے اس نے اس واہمہ کو ہمیشہ کے لیے غلط ثابت کیا کہ جنوبی سمندروں میں ایک ایسا براعظم ہے جس میں انسان بس سکتے ہیں۔ البتہ اس قسم کے کئی عجیب خطے کک نے واقعی دنیا کے نقشے میں شامل کر دیئے تھے۔ اس نے جزیرہ ایسٹر کا دوبارہ پتہ چلایا اور پہلی بار صحیح طور پر اس کے جائے وقوع کا تعیّن کیا۔ یہ بحر جنوبی کے جزائر میں انتہائی مغربی جزیرہ ہے اس کے علاوہ کک نے جزائر مارکوئیسیا اور جزائر ٹونگا یا فرینڈلی جزائر کا بھی پتہ چلایا۔ آسٹریلیا کے شمال مشرق میں اس نے نیوکیلی ڈونیا اور نارفاک جیسے عظیم جزائر کو پہلی بار دریافت کیا۔ جنوبی بحر اوقیانوس میں اس نے دوبارہ جزیرہ جنوبی جارجیا کا پتہ لگایا اور برطانیہ عظمیٰ کی قلمرو میں اسے شامل کیا۔

یہ جملہ سفر کوئی ایک ہزار دن میں مکمل ہوا۔ بحر پیمائی کے نقطۂ نظر سے بھی بالخصوص بحر جنوبی کے برفیلے میدانوں میں یہ سب سے زیادہ جرأت مندانہ اور کامیاب مہم تھی۔ تند و تیز جھکڑوں سے جھگڑتا، سمندری طوفانوں سے آنکھیں ملاتا اور ژالہ باری سے پنجہ کشی کرتا ہوا اندرونِ مُلک کا رہنے والا یہ لڑکا ایک سمندری پرند کی طرح بے خوفی سے سفر کرتا رہا۔ منطقہ حارّہ کے جزائر میں وہ جب کچھ عرصے کے لیے رکتا تو خواہ اس کا واسطہ آدم خوروں سے پڑتا یا نیم متمدّن قوموں سے کک محض اپنی شرافت اور کردار سے ان کا دل

موہ لیتا۔ جب کبھی وہ کسی مصیبت میں گھر جاتا تو اپنی تنومندی اور جرأت کے بل بوتے پر وہ مخالفوں سے اپنا لوہا منوا لیتا اور اس طرح اپنی قیادت کی دھاک بٹھاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک فسادی دونوں ہاتھوں میں دو مگدر لیے اس کی طرف بڑھا تو لگ تنہا ہی اس پر جھپٹ پڑا اور اس کے دونوں مگدر چھین لیے اور ران پر توڑ کر پھینک دیئے۔

شاہ جارج کے اس ایلچی کو ہر موقع پر یہ خیال رہتا تھا کہ اسے مقامی باشندوں پر اپنی دھاک بٹھانی ہے۔ بعض صورتوں میں جب وہ کسی جزیرے کے رہنے والوں کے تیور بگڑے پاتا تو اپنے تمام ملاحوں کو ساتھ لے کر قطار کی صورت میں جزیرے کے گرد مارچ کرتا۔ اگر اندرونی علاقوں کا کوئی خودسر قبائلی سردار اس سے ملاقات کے لیے آنے سے انکار کر دیتا تو لگ گرمی کی شدت برداشت کر کے جنگلوں کے راستے مچھروں کا مقابلہ کرتے ہوئے خود ہی وہاں پہنچ جاتا اور کچھ تو اپنی مستقل مزاجی اور کچھ تلطف سے برہنہ پا سردار کو شاہ جارج کی قوت و جبروت کا احساس دلاتا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ قبائلیوں کو یونین جیک کی تعظیم سکھاتا۔ اپنے مہمانوں کو آتشبازی سے ورطۂ حیرت میں ڈالتا اور جہازوں کی توپوں کی سلامی کے ذریعہ انہیں مرعوب کر دیتا۔

وہ ایک اچھا انگریز تھا اس لیے ہر روز صبح ساحل پر سرد پانی سے غسل کیا کرتا تھا۔ مقامی عورتوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے ذریعے اس نے ملاحوں کے سامنے ہمیشہ برطانوی عزت و وقار کی مثال قائم کی۔ وہ قبائل کو ان کے اخلاق، ان کی کھانے پینے کی عادات، اپنے دشمنوں کے ساتھ

ان کے سلوک، ان کے توہم پرستانہ عقائد، ان میں صفائی اور دیانت داری
کے یورپی معیار کے نقدان پر ٹوکنے اور ان کی سرزنش کرنے میں کوئی پس و پیش
نہیں کرتا تھا۔ وُہ جہاں کہیں جاتا جزیروں میں گایوں، بھیڑوں، بکریوں،
گھوڑوں، خرگوشوں، بطخوں، ہنس راجوں اور مرغیوں کی نسلیں پھیلانے کی
کوشش کرتا۔ لیکن بکریوں اور خرگوشوں کے سوا جو عام طور پر بھاگ جاتے اور
اپنی نسل میں خوب خوب اضافہ کرتے۔ یہ جانور یا تو موسم کی سختی برداشت نہ
کر سکے یا پھر مقامی آبادی یہ سوچ کر انہیں چٹ کر جاتی کہ آخر ان جانوروں
کو جو لقمۂ تر بن سکتے ہیں۔ جھاڑیوں میں آزاد چھوڑنے میں کیا تک ہے جہاں سے
انہیں دوبارہ پکڑا بھی نہیں جا سکتا۔ اسی حماقت کی وجہ سے یہ بکریاں اور خرگوش
مقامی فصلوں کے لیے مصیبت بن جاتے۔ لگ کو جہاں کہیں موزوں جگہ ملی۔ وہ
ہاں یورپی سبزیاں اور اجناس بو دیتا۔ لیکن مقامی لوگوں نے (مثلاً) انگور کے
گچھے بھی کھانے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وہ سمجھے کہ یہ پھل ہی زہریلا ہے، اور
انگوروں کی بیلوں کو انہوں نے سانپ کی طرح روند ڈالا۔ جزائر کے جن باشندوں
کی اس نے اس توقع میں تربیت کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اچھی باتوں کا احساس
کرائیں گے۔ وہ یورپین لباس اور اوزاروں وغیرہ کے عوض زمین اور عورتیں حاصل
کرنے لگے۔ ور آدم خور قبائل بھنے ہوئے گوشت اور پارک شائر پڈنگ پر ایک
موٹے تازے دشمن ہی کو ترجیح دیتے تھے۔

ان تمام نیک مقاصد اور ارادوں میں لگ تہذیب و تمدن کی
اصلاح کے سلسلہ میں کسی انگریز، امریکی، ڈچ یا ہسپانوی مشنری کے برابر صاف

باطن تھا۔ جہالت کی ضلالت و تاریکی میں پھنسے ہوئے لوگوں کو علم و اخلاق کی برکتوں سے نوازنے کی مساعی میں وہ پُرخلوص، مشفق اور صبر و استقلال کا پُتلا تھا۔ اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو ان مقاصد میں اس کو پوری طرح ناکامی نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے جن سمندروں کو پہلی بار عبور کیا ہے ایک دن وہ متمدّن تاجروں کی گزرگاہیں بنیں گی اور پھر وہ دن آئے گا جب ان وحشی قبائل کا صنعتی طور پر ترقی یافتہ تہذیب سے واسطہ پڑے گا لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس دن کے پیشِ نظر اس نے خود جو کوششیں شروع کی ہیں ان کے نتائج کتنے ہمہ گیر ہیں۔

آج کے ماہرینِ علم الانسان جب کُک کی بیان کردہ اس جنّت کا حال پڑھتے ہیں جسے تمدّن نے اس وقت تک بگاڑا نہ تھا تو وہ یہ سوچ کر دانت پیسنے لگتے ہیں کہ ان وحشیوں کی موسیقی، شاعری، نقش کاری، پارچہ بافی اور ظروف سازی، عقائد، رسوم اور رواج یا تو سرے سے ختم ہو گئے یا پھر بیرونی اثرات سے ان میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ اب ان کی قدر و قیمت آدھی بھی نہیں رہی تاہم کُک نے ایک بحری سیاح کی حیثیت سے ایک معرکۃ الآرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اس نے جنوبی سمندروں کے سنہری دَور کو جیسے دیکھا ویسے کا ویسا ہی بیان کر دیا اور برٹش میوزیم کی رونق میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے ساتھ جزائری باشندوں کے آرٹ کے جتنے بھی ذخیرے ملے، وہ سب لیتا آیا۔ اگرچہ ان قبائل کے ضرب المثل وحشیانہ طرزِ عمل سے وہ متنفر ضرور ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے ان کے بہادر مردوں، نرم دل عورتوں، اور

ذہین افراد کو اپنے سفر نامے میں جن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ لافانی ادب کا جزو ہیں۔

۱۷۷۶ء میں کک تیسری بار بحری سفر پہ انگلستان سے روانہ ہوا، اس دفعہ اس کے پاس دو جہاز 'دی ریزولیوشن' اور 'دی ڈسکاوری' تھے۔ اسے امارت بحریہ نے حکم دیا تھا کہ الاسکا اور سائبیریا کے مابین آبنائے کا کھوج لگائے اور شمالی امریکہ کے شمالی سرے سے بحر اوقیانوس تک بحری راستے دریافت کرے۔ آج ہمیں اس کا علم ہے کہ قطب شمالی کی برفانی چوٹی کی وجہ سے یہ راہ ناقابل گزر ہے اور غالباً کک بھی جب ۱۷۷۸ء کے موسم بہار میں شمال کی جانب آرگن کے ساحل کے ساتھ ساتھ تنگ اور انجان راستوں سے گزرتا ہوا الاسکا کی گہری گھاٹیوں کی جانب روانہ ہوا تو اسے اس سفر کی دشواری کا اندازہ تھا بہت سے ایسے راستوں میں وہ اپنے تجسس کی تسکین کی خاطر اپنا جہاز گھساتا ہوا گزرا جن میں سے بیشتر سفید فام باشندے ناواقف تھے۔ وہ آبنائے بیرنگ میں گھس کر الاسکا کے بعید ترین شمالی سرے تک پہنچ گیا اور برفانی میدانوں کو چیرتا ہوا ستر درجے اہم دقیقے شمالی عرض بلد تک جا پہنچا۔ حتیٰ کہ وہ بحر منجمد شمالی کے گرما میں بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس طرح اس نے یہ ثابت کر دیا کہ سارے بر اعظم کے اطراف کی شمال مغربی گزرگاہ باقاعدہ بحری سفر کے لیے ممکن نہیں۔

۱۷۷۸ء کے اوائل میں شمال کی طرف جاتے ہوئے کک نے جزائر ہوائی کی عظیم اور مسرت انگیز دریافت کی۔ پہلے اس نے ہوائی کو دیکھا اور

اس کے بعد ادا ہوا اور کوائی کو۔ ہسپانیہ کے ابتدائی مہم جوؤں کو اس جزیرے کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو ہو، تاہم یورپ والوں کو ان دور افتادہ پالی نیشن جزائر کا پہلی بار علم ہوا۔ اس کے بعد الاسکا پہنچ کر اسے جزائر ہوائی کے لوگوں کی شائستگی اور ذہانت یاد آئی۔ اسے ان کا حسن اور ان پھولوں کی خوشبو یاد آئی جن کی لطیف تر خوشبو سے اس کی قوتِ شامہ بے خبر تھی۔ چنانچہ وہ شمالی برف کے علاقے سے براہ راست دھوپ میں دہکتے جزیروں سے اس جھنڈ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ گو وہ صرف ۵۱ برس کا تھا تاہم اس نے یہ عمر ایسی جفاکشی میں گزاری تھی کہ اس کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کا عملہ بلاشبہ چنندہ اور بہترین تھا۔ جو زیادہ تر اس کے پچھلے سفر کے بہادر رفقاء پر مشتمل تھا اور اس میں "باؤنٹی" جہاز کے ولیم بلائی جیسے مشہور بحر پیما شامل تھے اور ایک نوجوان جہازی جارج ونکوور بھی تھا جس کی قسمت میں ایک دن امریکہ کے شمال مغربی ساحل کی بحر پیمائی لکھی تھی۔ کُک اس وقت تک ہر قسم کی جہاز رانی کا استاد اور پالی نیشن اور بحرالکاہل کے دوسرے جزائر کی زبانوں کا ماہر بن چکا تھا اور اتنا قابل سائنس دان کہ اس بار اس نے نہ کسی ماہر نباتات کو ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کی نہ کسی ماہر فلکیات کی۔ لیکن اب اسے بات بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے بھی پہلے کے سے پختہ نہیں رہے تھے۔ وہ پھر ایک بار نومبر ۱۷۷۸ء میں ہوائی پہنچا اس وقت اسے آرام کی بھی شدید ضرورت تھی اور دوستانہ خیر مقدم کی بھی، لیکن یہاں پہنچتے ہی اُسے جزیرے کے مقامی باشندوں کے رویہ میں ایک ایسی بات نظر آتی۔ جس سے اسے تشویش ہوئی۔ وہ دشمنی اور مخالفت سے

کوسوں دور بلکہ دوستی اور مروّت میں حد سے کچھ بڑھے ہوئے ہی تھے۔ کُک کے لیے مایوسی کا سبب یہ تھا کہ جزیرے کے باشندے اسے اور اس کے ساتھیوں کو دیوتا تصوّر کرنے لگے تھے کہ اچانک ۴ر فروری ۱۷۷۹ء کو خلیج کیلاکیکوا کے پیچھے ایک بحری طوفان اٹھا۔ جس نے مستول توڑ ڈالے اور بادبانوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔

جب طوفان تھما، تو کُک نے دیکھا کہ ساحل حیرت انگیز طور پر خالی ہو چکا تھا۔ جزیرے والوں پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ یہ دیوتا بھی عام انسانوں کی طرح فانی ہیں اور ان کے جہاز بھی دوسرے جہازوں کی طرح قدرت کی طاقتوں کے تابع تھے۔ چنانچہ بڑے مہنت نے جزیرے کے اس حصّے کو ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا۔ پھر کچھ دن بعد ڈسکاوری جہاز کی رکاب کشتی چوری ہو گئی۔ اور بعد ازاں یہ اس حالت میں ملی کہ مقامی باشندوں نے میخیں حاصل کرنے کی خاطر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ کُک نے چپکے سے کھسک جانے کی بجائے اسے ایک اخلاقی مسئلہ بنا دیا اور ان سے تاوان وصول کرنے کی خاطر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اتر پڑا۔ بعض جلد باز بحری سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ جس سے ایک حلیف سردار ہلاک ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے ساحل پر زور کی جھڑپ ہوئی اور اس دوران جیسے ہی کُک ایک حکم پکارنے کے لیے پلٹا۔ اس کے سر پر پیچھے سے ضرب پڑی۔ وہ گرا اور پانی میں سے اٹھنا چاہا تو اس کی پیٹھ میں نیزے پیوست کر دیئے گئے۔ اور ۱۰ر فروری کو غروب آفتاب کے وقت توپوں کی گرج کے درمیان دنیا کے عظیم ترین بحر پیما کا خاکی صدف گوہر حیات نکل جانے کے بعد سمندر کی گہرائیوں میں جاگزین ہو گیا۔



مائیکل اینجیلو

صورت گرِ فطرت

تختوں کی اونچی دیوار کے پیچھے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے بارے میں فلورنس کے باشندے کچھ نہیں جانتے تھے۔ مہینوں بلکہ برسوں تک اس راستے سے گزرنے والے پتھر پر فولاد کی ضرب اور چھینی پر ہتھوڑی کی جھنکار سنا کرتے تھے۔ بعض دفعہ تخلیق کی چوٹ طوفان کی شکل اختیار کر جاتی اور پتھر کے ریزوں کے اُڑ اُڑ کر نیچے گرنے کی آواز ژالہ باری سے کم نہ ہوتی۔ ایک شخص نے جسے ایک بار اندر جاکر ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ باہر آکر بیان کیا۔ وہ اپنے کام میں جوش و غضب کے وہ شرارے بھر دیتا ہے کہ میرا خیال تھا پتھر کے پرخچے اڑ جائیں گے وہ ایک ہی کراری چوٹ سے بڑے بڑے ٹکڑے زمین پر بکھیر دیتا ہے۔ خطوط اس باریکی اور نفاست سے تراشتا جاتا ہے کہ اگر بال برابر فرق آجائے تو سارے کام پر پانی پھر جائے۔

لیکن فلورنس والوں کو اس کا علم تھا کہ سنگ مرمر کا وہ ٹکڑا پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ عرصہ گزرا جب ایک اور سنگ تراش نے اسے بڑے بے ڈھنگے طور پر تراشا تھا ـــــ اس نے بڑی جلد بازی سے یہ کام شروع کیا۔ لیکن اسے مکمل نہ کر سکا۔ نچلے حصے پر اس نے مثلث نما گہرا گھاؤ چھوڑ دیا تھا۔ اور جب اس کے سنگین نتائج سامنے آئے تو گھبرا کر کام ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

فلورنس والے مرمر کی اس مہیب مسخ شدہ سِل کو "دیو" کہتے تھے۔ یہ محکمہ تعمیرات عامہ کے پاس ہی پڑا ہوا تھا اور کئی فن کاروں نے اسے سنوارنے کی سوچی، تاہم کوئی سو سال تک یہ محکمہ کے پاس ہی پڑا رہا ـــــ گویا یہ ایک ناقابل تسخیر "دیو" تھا۔

بالآخر ۱۳ ستمبر ۱۵۰۱ء کو پیر کی صبح، نوجوان مائیکل انجیلو بوناروتی ہاتھ میں چھینی لیے اس سے دو دو ہاتھ کرنے آگے بڑھا۔ چار سال تک وہ شبانہ روز اس پر محنت کرتا رہا۔ جب ججوں کی کمیٹی اس کا کام دیکھنے کے لیئے آئی تو انھوں نے اسے چار سو طلائی فلورنس انعام دیئے اور ساتھ ہی اسے یہ بھی اختیار دیا کہ وہ اپنی اس تخلیق کو نصب کرنے کے لیے خود ہی جگہ کا انتخاب کرے۔ مائیکل انجیلو نے کسی پس و پیش کے بغیر فلورنس کے سب سے نمایاں مقام کا انتخاب کیا۔ یعنی قدیم مہیب شاہی قصر کے سامنے امراء کے چوک میں ـــــ اور اس طرح اس مجسمہ نے پُرپیچ گلی کوچوں کے درمیان سے چرچراتی بلیوں پر چار روزہ سفر شروع کیا۔ چالیس آدمی اس آہنچہ پر کام کر رہے تھے جس کے ذریعہ اسے بلیوں پر لڑھکایا جا رہا تھا اور کچھ لوگوں نے شہر کے دروازہ کا ایک کواڑ توڑا تاکہ اسے گزارا جا

سکے۔ اس سمت سفر میں لوگوں کا ہجوم اس کے گرد جمع رہتا جو اسے دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے۔ بوجھ کھینچنے والوں کی ہمت بندھاتے اور اس کے پیچھے خوشی کے شادیانے بجاتے جاتے تھے۔ رات کے وقت جب تک پہرہ دار نہ لگا دیئے جاتے متعصب لوگ عریاں شباب کے اس عظیم مجسمے پر نفرت سے پتھر پھینکتے تھے ــــــــــ'

حضرت داؤد کا یہ مجسمہ اپنے دشمن جالوت پر نظریں گاڑے ہوئے ہوئے ہے۔ مرمر کی اس بے ہنگم سِل کا ہر سقم کمال میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ سِل کی بہت زیادہ اونچائی اور پتلا پن ایک قد آور تنومند اور گٹھا ہوا جسم بن چکا تھا۔ نچلے حصے پر جو مثلث نما مہلک گھاؤ پڑا تھا وہ اب مضبوط ٹانگوں کے درمیان کا فاصلہ بن چکا تھا۔ وہ چھینی جو بظاہر بڑی بے احتیاطی اور بے دردی سے مرمر پر چل رہی تھی۔ اس نے اصل میں انتہائی باریکی، نفاست اور صحت کے ساتھ ایک ایک پٹھا اور ایک ایک نس تراشی تھی جیسے ایک نوجوان مجاہد کا گرم خون واقعی ان رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ مائیکل اینجیلو کی دوسری عظیم تحقیقات کی طرح "ڈیوڈ" (حضرت داؤد کا یہ مجسمہ) ایک زندہ صداقت ہے اور آج بھی وہ اسی طرح جاوداں ہے۔ جس طرح آج سے ساڑھے چار سو سال قبل تھا۔ جب اسے مرمر سے ڈھالا گیا تھا۔ اس لیے کہ آج بھی دنیا میں کتنی جالوت بے لگام ہیں۔ اور کئی داؤد اسی طرح بل کھاتے ہوئے ابرو اور بے جھجک آنکھوں کے ساتھ ان سے نبرد آزمائی کے لیے میدان عمل میں نکلے ہوئے ہیں۔

مائیکل اینجیلو ڈی لیونارڈی بیوناروتی سمونی ۱۴۷۵ء میں

کیپر سز کے قریب پیدا ہوا۔ جہاں سے دریائے ٹائبر وسطی اطالیہ میں داخل ہوتا ہے۔ اسے دودھ پلانے کے لیے ایک پتھر پھوڑنے والے کی بیوی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ وہ اکثر مذاق میں کہا کرتا تھا کہ اس کا پیشہ اس کی رضاعی ماں کے دودھ ہی میں اسے ملا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ نوزائیدہ بچّے کے کانوں میں پہلی آواز پتھر پر چھینی کی جھنکار تھی اور اس کی ننھی ننھی انگلیوں نے پہلی بار جس چیز کو ٹٹولا ہوگا وہ گداز اور محبّت بھرا سینہ تھا جس کے جوئے حیات پر وہ پروان چڑھتا رہا۔ اسی ننھے منے ہاتھ کو آگے چل کر مریمیوں کی وہ تصویریں بنانے اور مجسمے تراشنے تھے جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین شہ پاروں میں ہوتا ہے لیکن جن پر اس کے ہم عصر یہ کہہ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے کہ یہ تو بس پتھر پھوڑنے والوں کی بیویاں ہیں۔ یہ تصاویر اور مجسّمے، گو انسانی قوّتوں کے مظہر ہیں لیکن ان میں الوہیت کی جھلک بھی ہے اس لیئے کہ کوئی عورت مائیکل انجیلو کی زندگی میں اس کی ساتھی نہ بن سکی تاہم اس کے تصوّر میں عورت اپنے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ چھ برس کی عمر میں مائیکل انجیلو کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور پھر ساٹھ برس سے تجاوز کرنے کے بعد کہیں جا کر اسے کسی عورت کی شفقت نصیب ہوئی۔ وہ مردوں کے کرخت ماحول میں اپنے خود غرض اور معمولی قابلیتوں کے مالک بھائیوں کے ساتھ پروان چڑھا۔ جو ہمیشہ اسے چوستے رہے، یا اس کا واسطہ ایک لالچی اور شاکی باپ سے رہا، جس نے اپنے لڑکے کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ سکول میں بحیثیت طالب علم وہ کمزور تھا اس لیے کہ وہ ہمیشہ تصاویر بناتا رہتا تھا۔ گھر میں بھی

وہ دیواروں پر خاکے اتارتا رہتا تھا۔ اس جرم میں وہ پٹا کرتا تھا اور جب پٹنے سے بھی باز نہ آتا تو اسے اور بھی شدت سے پیٹا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کمزور جسم میں ہاتھ اٹھانے کی ہمت بھی باقی نہ رہی۔ لیکن اس میں جو فن کار پوشیدہ تھا۔ اس نے کبھی ہار نہ مانی۔

اس کے باپ کو اپنے بیٹے کی صلاحیت سے دولت کمانے کی بڑی بھی۔ چنانچہ اس نے اپنے تیرہ سالہ سرکش لڑکے کو فلورنس کے گرلانڈائیو بھائیوں کے مشہور سٹوڈیو میں بھیج دیا۔ صرف اسی سٹوڈیو میں اس لڑکے کو تصویر کشی کی تربیت ملی۔ ایک دن جب کہ بہت سے شاگرد ڈینیکو گرلانڈائیو کے بنائے ہوئے ایک نسوانی خاکے کا مطالعہ کر رہے تھے تو مائیکل اینجیلو نے ایک موٹی پنسل اٹھا کر اس خاکے میں اصلاح کر دی۔ اس پر مزید غضب یہ ہوا کہ ڈینیکو نے جب دیکھا کہ اصلاح واقعی ٹھیک تھی تو مائیکل اینجیلو کو باہر کا راستہ دکھایا گیا۔ (لیکن پرزور سفارشی خط کے ساتھ) اور اس طرح وہ مجسمہ ساز برٹولڈو کی آرٹ فیکٹری میں پہنچ گیا۔

چند نائبین کے ساتھ برٹولڈو اپنے آجر لورینزو، دی میڈیسی کے باغات کی سجاوٹ کے لیے کلاسیکی مجسموں کی بھونڈی نقلیں تیار کر رہا تھا۔ لورینزو یورپ کا مال دار ترین ساہوکار اور فلورنس کا ایک طرح سے غیر سرکاری آمر تھا جس کے بے پناہ اسراف اور پرتکلف ذوق کے پیش نظر اسے عظیم الشان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ میڈیسی کے باغات میں مائیکل اینجیلو کے حصے یہ کام تھا کہ وہ دوسرے نقاشوں کے لیے مرمر کے ٹکڑے کاٹ دیا کرے۔ اس مشقت کے دوران میں ہر روز اس کے بازو طاقت ور ہوتے گئے اور نگاہ میں

پختگی آ گئی ـــــــ اور اس قدر پختگی کہ جب لورینزو کی نظریں ایک بابا اتفاقیہ مرمر کے ایک بیکار ٹکڑے سے اس کے تراشے ہوئے مجسمے پر پڑیں تو وہ اسے اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ مخملی خلعت عطا کی اور اپنے لڑکوں کے ساتھ ہم طعامی کا شرف بخشا۔ اس شاہی دسترخوان پر جہاں شعراء اور ادیبوں کا ہجوم رہتا تھا گپ شپ کی بجائے کتب بینی ہوتی تھی۔ یہاں نوجوان مائیکل اینجیلو نے افلاطون کے عظیم افکار اور دانتے کے پرعظمت اشعار سنے۔ چنانچہ یہاں اس کی ایک دوسری صلاحیت نے جنم لیا جس کی بدولت آگے چل کر اس نے ۷۷ سانیٹ لکھے جن میں سے ہر سانیٹ اتنا پُر از خلوص ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس کی روح کا ترشا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔

اس کی روح ازمنۂ قدیم کے کسی برگزیدہ ولی کی طرح عظیم تھی جو معرفت اور اخلاق کے نور اور جذبہ سے معمور تھی۔ لیکن اس کی انسانی شخصیت قابل رحم حد تک ناقص تھی، خود سر، جھگڑالو اور بدزبان ہونے کے سبب ایک دن وہ اپنے ایک ساتھی شاگرد سے لڑ پڑا اور اپنی ناک تڑوا بیٹھا۔ یہ جسمانی نقص اس میں زندگی بھر قائم رہا اور زخم کی گہرائی صرف چہرے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی روح کو بھی مجروح کر چکی تھی کیونکہ وہ شخص جو حُسن کو الوہیت کا مظہر سمجھ کر اس کی پرستش کرتا تھا۔ جب اپنے اوپر نظر ڈالتا تو اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ اوسط قد و قامت اور غیر معمولی طور پر بڑے شانوں کے ساتھ وہ ایک شکیل نوجوان تو نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اس کا جھرّی دار چہرہ، بھنچے ہوئے چوڑے ہونٹ، سرخی مائل

آنکھیں جن میں یرمیاہ نبی کے نوحوں کا سا غم اور مسیح کے مواعظ کی سی محبت موجزن تھی اس کو اور بھی بدصورت بناتے گئے۔

اچانک ۱۴۹۲ء میں عیاشی کی زندگی نے لورینزو کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بیٹے پائیرو کو مائیکل اینجیلو کے لیے اس سے بہتر کام نہ سوجھا کہ سرما کی ایک صبح اسے بلا کر اس نے اپنے محل کے صحن میں برف کا دیو بنوایا۔ میڈیسی کے دسترخوان کے خوشہ چین ایک ایک کر کے بکھرنے لگے اور بھرے دل کے ساتھ مائیکل اینجیلو محل کے کمروں کے چکر لگایا کرتا تھا۔

باہر دنیا میں ایک زبردست اخلاقی، سیاسی اور فوجی طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا۔ فرائیر میورا رولا کی مسحورکن آواز اور شعلہ بار آنکھوں کے زیر اثر شہریوں نے چیرہ دست میڈیسی خاندان کو نکال باہر کیا اور کٹر مذہبی اخلاقیات کی جانب حد سے زیادہ مائل ہو گئے۔ مائیکل اینجیلو جسے مذہب سے گہرا شغف تھا کلیسا کے سائے تلے مبہوت کھڑا فرائیر کی تقریر سن رہا تھا۔ فرائیر لوگوں سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ قیامت آئے نام و نمود کی تمام چیزیں آگ کی نذر کر دو۔ چنانچہ زرّیں پوشاکیں، قیمتی لباس اور زر و جواہر، انتہا یہ کہ وہ تصاویر بھی آگ کے حوالے ہو گئیں جن کے کسی زمانے میں شہر کے کوچہ و بازار میں جلوس نکالے جاتے تھے۔ نوجوان فنکار اس نظارے سے دہشت زدہ ہو کر شہر چھوڑ کر بھاگا اور بولونا میں پناہ گزیں ہوا جہاں اُس نے پہلی روزی خوب صورت مجسمے تراش کر کمائی۔ اس کے بعد وہ روم چلا گیا۔

روم کی قدیم تاریخی عمارتوں اور کھنڈرات نے اس سے اس

زبان میں گفتگو کی جسے وہ خوب سمجھتا تھا اور اس کے دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور وہ اسی عالم میں کبھی ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈیوں پر چلتا فتوحات کی یادگار محرابوں سے گزرتا، بلند ستونوں کو تکتا اور اجڑے ہوئے چوکوں میں گھوما کرتا۔ مزید برآں اس نے لاؤکون جیسے مدفون نوادرات کا احیا، اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیئے کہ اسی زمانے میں کھدائی سے کلاسیکی عہد کے بعض عظیم ترین خزانے باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک "دم توڑتا ہوا گال" کو دوبارہ اصلی حالت میں لانے میں مائیکل اینجیلو نے بڑی مدد کی اور اس نے اس مجسّے کا وہ غائب ہاتھ تراش کر جوڑا جس پر مہلوک زخمی جنگ باز جھکا ہوا تھا۔

وہ روم، جس کی عظمت پارینہ اس کے لیئے سرچشمہ وجدان تھی، اب باقی نہ رہا تھا۔ اب یہاں رشوت اور بدعنوانیوں کا دور دورہ تھا، اور اس شہر میں اس نے اپنے آپ کو تنہا بے یار و مددگار اور قلّاش پایا۔ روم کے قرون وسطیٰ کے پیچیدہ گلی کوچوں میں تقریباً ہر روز ہی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ رات کے وقت ان اندھیرے کوچوں کو زنجیروں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ ازمنۂ قدیم کے پکّے نالے اور بدرو ٹوٹتے پھوٹتے جا رہے تھے اور کوئی شخص ان کی تعمیر و مرمّت میں نہ دلچسپی لیتا تھا نہ اس کا اہل تھا۔ ویٹیکن بھی کوئی اچھا مقام نہیں رہا تھا۔ خود سینٹ پیٹرز کی سیڑھیوں پر قتل ہوا کرتے تھے اس لیے کہ اس وقت پاپائیت ہسپانیہ کے بدنام بورجیا خاندان کے ایک لٹیرے کے قبضے میں تھی جس نے خود کو الیگزینڈر ششم کا لقب دے رکھا تھا۔ مائیکل اینجیلو نے ایک سانیٹ کے دو مصرعوں میں ساری کہانی کو یوں سمو دیا ہے:

یسوع مسیح کا خون اتنے پیسے پاؤ کے بھاؤ فروخت ہو رہا ہے

اس لیے کہ روم آج بھی یسوع کی کھال کھینچتا اور عدالت میں فروخت کرتا ہے؛

تاہم یہیں مائیکل اینجیلو نے اپنا پہلا عظیم شاہکار تخلیق کیا جس میں دکھایا گیا ہے کہ مریم مُردہ مسیح کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، نقادوں نے اعتراض کیا کہ مریم کا چہرہ اتنا تر و تازہ ہے کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں معلوم نہیں ہوتی۔ "پاکیزگی ہمیشہ جوان رہتی ہے۔" مجسمہ ساز نے جواب دیا۔ اس نے بعض لوگوں کو جو مجسمہ دیکھنے آئے تھے، سرگوشی میں اس کے کام کو کسی اور فن کار سے منسوب کرتے سنا۔ اس پر وُہ ایک رات چپکے سے کلیسا میں گھس گیا اور اس مجسّے پر اپنا نام کندہ کر دیا۔ اس طرح یہ واحد مجسمہ ہے جس پر مائیکل اینجیلو کے دستخط موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی اور یہ مجسّمہ تراش ہی نہیں سکتا تھا۔ ماں کا غم اس قدر پُر شکوہ ہے کہ اس میں آنسوؤں کی سطح سے بھی بلند پوری کائنات کے غم کی جھلک ہے اور مردہ بیٹے کا حُسن بھی اس قدر بے مثال ہے کہ یہ حسن خود مسیح کی الوہیئت پر دال ہے ——— کوئی تعجب نہیں جو آج یہ مجسّمہ سینٹ پیٹرز کے گرجا میں نصب کیا گیا ہے۔ کیتھولک کلیسا کی جانب سے ایک فن کار کو یہ سب سے بڑا خراج عقیدت ہے۔

جب الیگزینڈر اچانک مر گیا ویٹیکن میں یہ افواہ گرم تھی کہ اس کی موت اس زہر سے واقع ہوئی جو وہ کسی اور کے لیے تیار کر رہا تھا، تو جولیس دوم اس کا جانشین بنا۔ یہ ایک دیانت دار اور قابل منتظم تھا۔ منصب کے اعتبار سے وُہ شہزادۂ امن (حضرت مسیح) کا کارندہ تھا۔ لیکن فطرتاً وہ ایک دنیادار اور جنگ پسند

آدمی تھا اور یادگاروں اور عمارتوں کے لیے وہ جو پُرشکوہ منصوبے بناتا تھا ان کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوتی تھی۔ چنانچہ سینٹ پیٹرز کی خستہ اور غیر محفوظ عمارت کو اس نے اس قدر عجلت سے منہدم کر دیا کہ اس پر بہت سارو پیہ ضائع گیا۔ مقصد یہ تھا کہ نئی عمارت کا سنگ بنیاد اسی کے اپنے ہاتھوں سے رکھا جائے، اور اس تصور کے تحت کہ تاریخ اس جیسی شخصیت سے یہ متوقع ہوگی کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا مقبرہ تعمیر کرے۔ اس نے اس عمارت کی تعمیر کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس سلسلہ میں اس نے اس فن کار کو طلب کیا جس کے پاس عظیم ترین تصورات موجود تھے۔ اس طرح مائیکل اینجیلو سے اس کی دوستی کی بنیاد پڑی۔

دوستی کے ساتھ ہی لڑائی ہوگئی لیکن اس کا آغاز اچھا ہوا۔ مقبرے کے لیے مائیکل اینجیلو کی تجاویز نے جولئیس کو خوش کر دیا۔ اس مقبرے میں اڑتیس کے لگ بھگ ایسے مجسمے نصب کرنے کا منصوبہ تھا۔ جن میں اولیاء اور پیغمبروں کو پوپ کے تابوت کے اردگرد جمع ہوتے دکھایا جائے۔ چنانچہ مائیکل اینجیلو سنگ مرمر لانے کے لیے کیرارا کی معدنوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس دوران میں جولئیس اپنی فوجی مہمات میں مصروف ہوگیا۔

جب فن کار ڈیکن واپس آیا تاکہ تقدس مآب سے سنگ مرمر کی بار برداری کے اخراجات طلب کرے تو پوپ جولئیس نے جو بولونا کے خلاف ایک گراں مصارف کی جنگ میں مصروف تھا۔ اسے دھتکار دیا۔ اس پر مائیکل اینجیلو نے پوپ کے نام ایک انتہائی غصہ بھرا خط لکھا، اور پھر بعد میں خود اپنی اس حرکت سے خوفزدہ ہو کر اس نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ پوپ کے آدمیوں نے

جنہیں مائیکل اینجیلو کو پکڑ لانے کے احکام تھے۔ تیز رفتار گھوڑوں پر اس کا بہت دور تک تعاقب کیا۔ لیکن اس دوران میں مائیکل اینجیلو ٹسکن کے علاقے میں پہنچ چکا تھا جو پوپ کی عملداری سے باہر تھا۔

پوپ نے فلورنس سے، مائیکل اینجیلو کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن فلورنس کے ٹھنڈے دل و دماغ کے ارباب اختیار نے اس کی بجائے خود مائیکل اینجیلو کو یہ ترغیب دی کہ وہ بولونا جا کر جولیئس سے ملاقات کرے۔ اس مقصد کے لیئے اس کو سفارتی حقوق و مراعات عطا کیے گئے۔ چونکہ بولونا اسقف اعظم کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ اس لیے اس کا دل بھی اب نرم پڑ گیا تھا۔ مائیکل اینجیلو کی خطا بخش دی گئی اور وہ پوپ کے پیچھے پیچھے روم روانہ ہوا۔

لیکن کسی نے جولیئس کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ تعمیر کرانا بدشگونی ہے۔ مزید برآں ابھرتا ہوا نقاش رافیل اور اس کا ایک رشتہ دار برامانتے جو نئے سینٹ پیٹرز کے معمار تھے ویٹیکن میں مائیکل اینجیلو کے اثر و رسوخ سے جلنے لگے تھے۔ انہوں نے جولیئس کو ترغیب دی کہ وہ مائیکل اینجیلو کو پوپ کے نجی گرجا سسٹینی کی چھت پر نقاشی کا حکم دے۔ غالباً انہیں یہ توقع تھی کہ وہ اس آزمائش میں ناکام رہے گا ـــــ مائیکل اینجیلو نے احتجاج کیا کہ نقاشی میرا فن نہیں۔ یہ فرض رافیل کو سونپا جائے۔" لیکن جولیئس کو بھی کسی طاقتور شخص کی گردن اپنی مرضی کے آگے خم کرانے میں لطف آتا تھا۔ اس طرح اگلے چار برس تک مائیکل اینجیلو سسٹینی کے تاریک و بے رونق گرجا میں قیدی بن گیا ـــــ پہلے تو پوپ کا قیدی پھر خود اپنے وجدان کا قیدی۔

کسی فن کار کو اتنا مشکل اور دقت پسند کام کبھی نہ سونپا گیا تھا۔

یہ کلیسا ایک تاریک، تنگ ڈربہ نما عمارت ہے جو اپنی چوڑائی سے زیادہ اونچی ہے اور اس کی چھت ڈاٹ دار ہے۔ اس کے عجیب و غریب گوشے اور زاویے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کرتے تھے۔ اس سارے حصے کو جس کا رقبہ دس ہزار مربع فٹ تھا۔ استر کاری میں مختلف تصویروں کے ذریعے بھرنا تھا۔ پلستر اور استر کاری پر تصویریں بنانے کی تکنیک یہ ہے کہ رنگوں کو تیل کی بجائے پانی میں گھونٹا جاتا ہے اور پھر انہیں گیلے پلستر کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ جب پلستر خشک ہو جاتا ہے تو رنگ مستقل طور پر چونے میں جم جاتے ہیں۔ گویا آرٹسٹ کو بڑی تیز رفتاری اور چابک دستی سے نقش کرنا پڑتا ہے کہ مبادا کوئی لغزش یا فروگزاشت دائمی حیثیت اختیار کرے۔

سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر مچان پر پہنچ کر مائیکل اینجیلو کو چت لیٹ کر اسی حالت میں اوپر نقش کاری کرنی تھی۔ ان چار طویل برسوں میں اس پر جو کچھ بیتی وہ اسے ایک سانیٹ میں اپنے دوست کو یوں سناتا ہے:

"اس اندھیری کوٹھڑی میں رہتے رہتے مجھے گلھڑ ہو گیا ہے۔
جیسے لومبارڈی کے گندے نالوں کی بلیوں کے گلے پھولے ہوتے ہیں،
اس کی وجہ سے پیٹ گویا بالکل ٹھوڑی کے ساتھ آ لگا ہے۔
میری داڑھی کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا ہے اور گدّی اندر کی طرف
ریڑھ کی ہڈی میں گھُس جاتی ہے۔
ہنسلی ایسے نظر آتی ہے جیسے بربط کا ابھار،

اور برش سے رنگ کے چھینٹے میرے چہرے پر نقش و نگار بناتے ہیں،
میری رانیں پسلیوں سے رگڑ کھاتی رہتی ہیں۔
اور کولھوں پر جسم کا سارا بوجھ رہتا ہے۔
اور ٹانگیں ہوا میں لہراتی رہتی ہیں۔
جسم کے اگلے حصّے کی کھال تو ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔
میں جانتا ہوں کہ ذہن اور نگاہ کی کجی کا پھل بھی انوکھا اور غیر حقیقی ہوتا
ہے، کیونکہ جو بندوق سیدھی نہ ہو اس کا نشانہ کیا درست ہو گا۔
آؤ گیووانی! میری مردہ تصاویر اور شہرت میں جان ڈالنے کی کوشش کرو
چونکہ میرے ساتھ بُرا سلوک ہو رہا ہے اور میرا فن میرے لیے باعث شرم ہے!"

کشف و الہام کے نظارے کرتے اور خود اپنی تخلیق کی غلامی میں کام کرتے ہوئے مائیکل اینجیلو بعض دفعہ خواب و خور تک کو فراموش کر جاتا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے سارے مددگاروں کو باہر بھگا دیا، اور دروازے کو تالا لگا دیا۔ صرف ایک بوڑھے ملازم کو اندر رہنے کی اجازت تھی، کبھی کبھی جب وہ آنکھیں جھپکاتا باہر نکلتا تو بھاگا بھاگا رافیل کے پاس جاتا جو ویٹیکن کے بڑے ہوادار کمروں میں سیدھی سادی دیواروں پر جولئیس کی فوجی فتوحات کے شاندار مناظر بناتا ہوتا نوجوان، خوش شکل، خوش اطوار، اخلاق باختگی کی حد تک خوش مزاج، اچھے کپڑوں اور شراب کا رسیا، عورتوں اور ساتھی نقاشوں کا محبوب رافیل مائیکل اینجیلو کا تپاک سے خیر مقدم کرتا اور اس تپاک کے جواب میں مائیکل اینجیلو بڑے چڑچڑے پن کے ساتھ اس سے پیش آتا۔

مائیکل اینجیلو سسٹینی کے دروازے مقفل رکھنے میں ہمیشہ محتاط رہتا اور کہا کرتا تھا کہ ایک عظیم نئی تکنیک مال و زر کی طرح چرائی جا سکتی ہے۔

خود جولیس اپنی بید سے دروازہ زور سے کھٹکھٹاتا تو وُہ کھولتا، پھر وہ خطرناک سیڑھیوں پر تقدس مآب کو لے کر چلتا تاکہ وہ چھت پر اس کی عظیم محنت کا مشاہدہ کر سکیں۔ جولیس آرٹ کو تو سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن عظمت و شوکت پر اس کی نظر پڑتی تو وہ پہچان لیتا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ زندگی بہت مختصر ہے وہ طوفان مچا دیتا کہ آخر یہ کام کب پورا ہوگا؟ تم ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ بس اب ہوا کہ اب، جیسے جیسے سال گزرتے گئے جولیس کے لب و لہجے میں بے صبری کا رنگ آتا گیا۔

"یہ کام بس پورا ہو چکا، مَیں کہتا ہوں تم اس مچان سے نیچے اترو، ورنہ مَیں تمہیں باہر پھنکوا دوں گا۔" اس دھمکی سے خوف زدہ ہو کر —— اس لیے کہ وہ واقعی ایک بار نیچے گر پڑا تھا —— مائیکل اینجیلو نے آرٹ اور فیشن کے دلدادگان اور ارباب کلیسا کو اندر آنے کی اجازت دے دی اور یہ لوگ جوق در جوق آتے گئے، ان کی نظروں کے سامنے اوپر جیسے پوری کائنات کھل گئی اور آسمان پہ توریت کا باب پیدائش تحریر ہوا۔ گرجا کی چھت پر تخلیقِ کائنات، زوالِ آدم اور طوفانِ نوح کی داستان نقش تھی۔ خداوند خدا ایک حاکمانہ اشارے سے عدم کو وجود میں لاتا نظر آتا ہے۔ وہ خاک پر پھوک مارتا ہے، اور وہ دیکھو! آدم خدا کی شبیہہ میں پیدا ہو رہا ہے۔ خداوند کی انگلی آدم کی انگلی سے ابھی ابھی الگ ہوئی ہے اور آدم عقیدت مندانہ نظروں سے اپنے خالق کے چہرے کو تک

رہا ہے، اور "حوا" رب العزت کے بازو کی پناہ میں اپنی نسوانی نگاہ اشتیاق
اور خوف کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اپنے مالک مجازی اور آقا کو دیکھ رہی
ہے۔ چھت کے پیچیدہ گوشے رسولوں اور کاہناؤں کے چہروں اور پیکروں سے
پُر تھے۔ ہر تصویر ادراک کی رسائی سے دور اور اس قدر سنجیدہ تھی جیسے مصوری
میں سنگ تراشی کی گئی ہو۔ سسٹینی گرجا میں ۳۴۳ سے کم بڑی اشکال ہیں اور ان
میں سے ہر ایک فن کی معراج ہے۔

اسی عہد نامہ قدیم کی سی عظمت و شوکت کا اظہار سنگ مرمر کے
مجسمے "موسیٰ" سے ہوتا ہے، جو پوپ جولیئس کے کبھی مکمل نہ ہونے والے مقبرے
کا ایک حصّہ ہے۔ لیکن اس قدر بارعب کہ جس کلیسا میں یہ مجسمہ نصب ہے، وہ
اس کے باعث منور نظر آتا ہے۔ روم کے یہودی قطار اندر قطار آتے اور اپنے
دینی پیشوا کے چہرے کے آشکارا جذبات کو حیرت و استعجاب سے تکا کرتے۔
موسیٰ نبی کے پنجے کوہ سینا پہ جمے ہوئے ہیں اور جلوۂ باری کی گرج اور چمک
چاروں طرف پھیلی معلوم ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں شریعت خداوندی کی لوحیں
تھیں، اور آنکھوں میں اپنی اُمّت کے اخلاقی زوال پر غصّہ کی آگ۔ یہ روائت
مشہور ہے ——— اور اس میں صداقت نظر آتی ہے کہ جب مائیکل اینجیلو نے
مجسمہ مکمل کر لیا تو اس پہ چھینی کی آخری ضرب لگا کر حکم دیا۔ اب منہ سے بولو،
اور مجسمہ کے مرمریں لبوں پر توریت کے دس احکام جاری ہو گئے۔

لیکن جب مائیکل انجیلو اپنے فن کے وسیلے سے ایسی لافانی
اور ابدی حقیقتیں بیان کر رہا تھا، اسی زمانے میں مذہبی مناقشات کا دَور دَورہ

تھا۔ پوپ لیئو دہم (لرنزو ـــــ عظیم الشان کا بیٹا) کے دنیوی اسراف کی بدولت ویٹیکن کے خزانے ہی کا نہیں بلکہ اخلاق کا بھی دیوالیہ نکل چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نصف سے زیادہ یورپ پروٹسٹنٹ انقلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اٹلی پر ایک طرف فرانسیسی، جرمن اور ہسپانوی فوجوں نے حملہ کیا اور دوسری طرف خانہ جنگی نے اسے پارہ پارہ کر دیا۔ اس وقت لیئو کا جانشین پوپ کلیمنٹ اپنے میڈیسی خاندان کے افراد کے ساتھ فلورنس کی طرف سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس نازک لمحے میں فن کاروں کے اس شہر نے اپنے عظیم ترین فرزند کو مدد کے لیے پکارا اور مائیکل اینجیلو مہینوں، پہاڑیوں کی قلعہ بندی اور موزوں مقامات پر توپیں نصب کرنے میں مصروف رہا۔ جب دشمن نے گھیرا تنگ کر لیا تو اسے اس بدنصیب شہر سے نکلنا پڑا۔ لیکن خوف زدہ ہونے کے لیے بھی بہادر ہونا ضروری ہے اور وہ اس شہر پر دشمن کا قبضہ ہونے سے پہلے اس کے دکھ خود بھی جھیلنے کے لیے دوبارہ فلورنس لوٹ آیا۔ میڈیسیوں کا انتقام طویل بھی تھا اور ہمہ گیر بھی، لیکن کلیمنٹ نے اگر کسی کو معاف کیا تو وہ تنہا مائیکل اینجیلو ہی تھا۔

خونریزی اور خوف کے ان ہی ایّام میں مائیکل اینجیلو کے سکون و سکوت کے عظیم شاہکار میڈیسی مقابر وجود میں آئے۔ یہ مقابر فلورنس میں سان لورانزو کے کلیسا سے متصل گرجا میں واقع ہیں۔ زائرین کا سیلاب یہاں کبھی نہیں تھمتا۔ جب کوئی شخص اس کمرے میں جاتا ہے جس کی دیواروں کو مائیکل اینجیلو کے فن نے زیب و زینت کا شاہکار بنایا ہے تو دیکھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے اور اس کی نبضیں ابھرنے ڈوبنے سے گویا بے نیاز ہو رہتی ہیں۔ یہاں روح

کی بے تابیوں کو ساکت ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کے سامنے ہی دو مقبرے ہیں ان میں سے ایک مقبرہ لورینزو مانی، ڈی، میڈیسی کا اور دوسرا اس کے چچا گیولیانو کا ہے۔ اس میں نوجوان گیولیانو ہلکی زرہ بکتر پہنے اس انداز سے کھڑا ہے کہ اس کا ہاتھ اس کی کمر سے لٹکی ہوئی تلوار کے قبضے پر ہے، نوجوان گیولیانو اس تصویر میں ناآسودہ خواہش کے ساتھ عمر کے اس حصے کی طرف حسرت سے تک رہا ہے جو اس کے نصیب میں نہ تھا۔ اس تصویر کو عام طور پر "عملی زندگی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل "مستغرق زندگی" نامی تصویر میں لورینزو کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ اس کا سکوت آموز ہاتھ اس کے منہ پر ہے، ایک خود اس کی آنکھوں پر سایہ ڈال رہا ہے اور آنکھیں نیچے کو جھکی ہوئی مرگ تنہائی کے آثار کو دیکھ رہی ہیں۔

اور پھر ایک اور پوپ نے (یہ پوپ بھی کتنی تیزی سے مرتے رہے اور اینجیلو نے کتنے ہی پاپاؤں کا زمانہ دیکھا) سن رسیدہ فن کار کو ایک اور تھکا دینے والے کام پر مامور کیا۔ ابھی سسٹین گرجا کی قربان گاہ کی عقبی دیوار تزئین و آرائش کی محتاج تھی چنانچہ اینجیلو مزید سات اذیت ناک سال تک دوبارہ نقاشی میں مصروف رہا۔ اب اس نے "آخری فیصلہ" نامی تصویر بنائی جو اس لمحے کی عکاسی کرتی ہے جب اسرافیل اپنا صور پھونکیں گے۔ جب قبریں اپنے مُردوں کو اُگل دیں گی۔ جب بادشاہ اپنے غلاموں کی طرح برہنہ شہنشاہ ازل کے دربار میں صف بستہ ہوں گے۔ جب نیک بندوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کی جزا ملے گی اور معتوب اور راندۂ درگاہ ابدی عقوبت میں مبتلا کر دیئے جائیں گے۔

مائیکل اینجیلو اب بوڑھا ہو چلا تھا ——— اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ——— اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے جو جد و جہد کی، وہ اسے دیمک کی طرح چاٹ چکی تھی۔ کچھ عرصہ وہ ایک معزز خاتون وٹوریا کولونا کی رفاقت سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس نے اس خاتون کے سامنے اپنے تمام دلی افکار و خیالات آشکارا کر دیئے۔ یہ شرف کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔ جب موت کے سرد ہاتھوں نے اس خاتون کو اس سے چھین لیا تو مائیکل اینجیلو تقریباً گوشہ نشین ہو گیا اور اس نے روم میں اپنے ایک چھوٹے اور گمنام سے مکان سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ان دنوں وہ محتاجوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ حالانکہ وہ کئی عمدہ مکانوں اور وسیع و عریض کھیتوں کا مالک تھا۔ اپنے بھائیوں کا کفیل تھا اور اس نے اپنے نگار خانے میں کثیر پونجی بھی چھپا رکھی تھی۔ وہ ہر سال خفیہ طور پر نیک کردار غریب لڑکیوں کو جہیز بھی مہیا کرتا رہا تاکہ وہ اچھی جگہوں پر شادیاں کر سکیں، اگر وہ بخیل کی طرح اپنی زندگی بسر کرتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اس دنیا میں اس کے لیے کوئی کشش باقی نہیں تھی۔

اس کے باوجود مائیکل اینجیلو اسّی کے پیٹے میں پہنچا تو ایک نئی ذمہ داری اس کے سر آن پڑی، جب اسے سینٹ پیٹر گرجا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام سپرد ہوا تو فنِ تعمیر میں اس کی حیثیت ایک نو آموز کی سی تھی۔ اس گرجا کا سنگِ بنیاد تقریباً پچاس برس قبل رکھا گیا تھا لیکن ابھی اس پر چھت نہیں پڑی تھی۔ اس عمارت پر بہت سے معمار کام کر چکے تھے لیکن ان کے منصوبوں میں کوئی چیز مشترک تھی تو وہ یہ کہ اس کا طول و عرض کیا ہو۔ اسے دنیا کے سب سے

بڑے گرجا کی حیثیت سے تعمیر کرنا مقصود تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ کے حواری مقدس پطرس کی باقیات یہیں دفن تھیں اور یسوع مسیح نے انہی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "اسی چٹان پر میں اپنے گرجا کی بنیاد رکھتا ہوں۔"

اس کام میں اتنی مدّت صرف ہوئی کہ مائیکل اینجیلو نے فرصت کے اوقات سے فائدہ اٹھا کر روم میں کئی اور عمارتوں کے نقشے تیار کیے۔ ان عمارتوں میں گرجا، محلات، دروازے، پُل، عجائب گھر، زینے اور صحن شامل تھے ______،

آخر میں اس کی طبع زاد اور عظیم الشان طرزِ تعمیر اس جادو وال شہر پر اس طرح چھا گئی جیسے کوئی شاندار نغمہ پتھر کے قالب میں ڈھل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ سینٹ پیٹر کے گرجا کے لیے اس نے جو خاکے تیار کیے تھے ان میں سے بعض میں رنگ بھرنے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن گرجا کا فقید المثال گنبد اسی کی پرواز فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ گنبد اگر ایک طرف اس کلیسا کو عظمت بخشتا ہے تو دوسری طرف یہ اس فن کار کی کلاہِ افتخار کا طرّۂ امتیاز ہے۔ حاسد ماہرینِ تعمیر نے اس گنبد کے نقشے کو مسترد کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، انجنیئروں نے اسے ناممکن العمل قرار دیا، اور تو اور خود پوپ نے بھی اینجیلو کو کئی بار یہ طعنہ دیا کہ بڑھاپے کے سبب وہ اس کام کا اہل نہیں رہا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے ہر مخالفت پر قابو پا لیا۔

آہستہ آہستہ قطار در قطار یہ عظیم گنبد حباب کی طرح تناسب و توازن کے سانچے میں ڈھلتا رہا اور ہر قطار جب نیچے سے ابھر کر مرکز کے

قریب پہنچتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ کشش ثقل کے اصول سے کھلی سرکشی کر رہی ہے۔ بالآخر موت نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کہتا۔ "میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ موت سائے کی طرح میرے ساتھ لگی ہوتی ہے۔" لیکن نوّے سال کی عمر میں موت سے ہم کنار ہونے سے قبل مائیکل اینجیلو بیونا روتی نے اپنے کام یعنی دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے خوب صورت گنبد کو پایہ تکمیل تک پہنچتے دیکھ لیا۔ روشنی، ساز کی جھنکار، عبادتی طربیہ نغمات سے معمور یہ وسیع گنبد جو قوّت کی معراج کا مظہر ہے ——— اور دُنیا میں اگر کسی جگہ اس عظیم روح کی آخری بازگشت سنی جا سکتی ہے تو وہ یہی جگہ ہے!



کارل شرز

جرمن ——— امریکی

اس دنیا میں اپنی حیاتِ مستعار کے مقرر کردہ آخری دن کے طلوع نے بڑھ کر نوجوان لفٹیننٹ کی آنکھیں کھولیں ——— اور معاً یہ خیال اس کے ذہن میں اُبھر آیا ——— آج مجھے باہر نکال کر گولی مار دی جائے گی۔

پروشین افسروں کی بحیرہ بالٹک کی سی سرد و سرمئی آنکھوں کے آگے اس کے قلب کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ یہ دل دو طوفان خیز برسوں تک اس جمہوری انقلاب کے لیے دھڑکتا رہا تھا جو ان دنوں جرمنی میں برپا تھا۔ میدان جنگ میں اس نے اپنے دادا کی اس تلوار کو بے آبرو ہونے نہیں دیا۔ جو اس کے ہاتھوں میں اس کی ماں نے تھمائی تھی۔ بڑے بڑے جلسوں میں جہاں اس کی آتش نوائی نے طالب علموں، کاشتکاروں اور سپاہیوں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ اس نے دراصل ان خاندانی روایات کی پیروی کی تھی جو اس کے باپ نے اس کے

سپرد کی تھیں۔ جب بچپن میں جارج واشنگٹن کی تصویر دکھا کر اسے یہ بتایا تھا کہ یہ دنیا کا عجیب ترین انسان تھا۔

لیکن آج ۱۷ر جولائی ۱۸۴۹ء کے منحوس دن اس کا جسم جو ابھی تک اپنے تمام جبلی تقاضوں کے ساتھ گرم تھا، ٹھنڈا ہو کر اپنے ساتھی انقلابیوں کی لاشوں پر گر پڑے گا۔ کیوں کہ ان کا آخری مورچہ یعنی راسٹارٹ کا قلعہ چند گھنٹوں میں ہتھیار ڈالنے والا تھا۔ نوجوان بڑے رنج و اندوہ کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ خاص طور سے انقلاب کے قائد اور یونیورسٹی آف بون میں اپنے قدیم استاد پروفیسر گاٹفریڈ کنکل کے لیے اس کا دل خون رونے لگا، اور پھر اس نے اپنی زندگی کا آخری کام یہ کیا کہ بیٹھ کر اپنے والدین کے نام ایک الوداعی خط لکھا۔ جو اس جملے پر ختم ہوا ——— "آپ کا پیارا بیٹا ——— کارل"

اور پھر اچانک لفٹیننٹ شرز پر امید جلوہ گر ہوئی، ایک بدرو شہر پناہ سے باہر نکلتی تھی۔ کیوں نہ اس راستے سے وہ فرار ہو جائے؟ جب فوجوں کے آخری اجتماع کے لیے بگل بج رہے تھے تو وہ اور اس کا ایک ساتھی، ایک وفادار اردلی لڑکے کے ساتھ بدرو میں اتر گئے اور گھنٹوں اندھیرے میں رینگتے رہے ———،

کارل اور اس کے ساتھیوں نے اپنے سر پہ فاتح پروشیا والوں کے قدموں کی بھاری چاپ سنی، جو قلعہ کو اپنی تحویل میں لے رہے تھے، اچانک پانی کا ایک ریلا بدرو میں داخل ہوا اور ان تینوں کو تقریباً غرق کر گیا۔ وہ مشکل سے بدرو کے سرے تک پہنچے تو وہاں پہریدار دل کو کھڑا پایا۔ چنانچہ وہ واپس شہر کی

طرف رینگنے پر مجبور ہو گئے، اندھیرا چھا جانے کے بعد وہ گلیوں میں نکلے اور باغی وردیوں میں اِدھر اُدھر چھپتے پھرے۔

بالآخر کئی دن بعد یہ مختصر سی جماعت بدرو میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ بدرو کے سرے پر سے اب پہرہ اٹھ چکا تھا۔ انھوں نے ایک بجرے میں بیٹھ کر دریائے رھائن کو پار کیا، اور فرانسیسی السا‌سؔ (ALSACE) کی سرزمین پر پہنچ کر آزادی کا سانس لیا۔

لیکن کارل کو یہ غم ستا رہا تھا کہ کنکل ابھی تک قید میں ہے۔ بعد ازاں اسے معلوم ہوا کہ دوسرے پناہ گزینوں نے پروفیسر کے فرار کا انتظام کرنے کے لیے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ رقم کی یہ تھیلی ۲۱ سالہ کارل شرز کے ہاتھ میں دی گئی اور وہ جس پر اس وقت تک بھی حکومت کے خلاف غداری کا الزام تھا۔ کنکل کو جرمنی کے سب سے مضبوط قلعہ نما قید خانے سے رہائی دلانے کے لیے دوبارہ پروشیا کے علاقہ میں داخل ہوا۔

یہ ایک جان جوکھوں کا انتہائی خفیہ منصوبہ تھا۔ جس کا تانا بانا مہینوں کی ہوشیاری اور احتیاط سے بنا گیا تھا۔ بالآخر پہرے کے سپاہی کو رشوت دے کر کنکل کو جیل کے ایک دریچے سے تاروں کی چھاؤں میں نیچے لٹکا کر اتار لیا گیا، اور کچھ دیر بعد ایک بگھی ہر دو مفروروں کو لیے رات کے اندھیرے میں کھڑکھڑاتی ہوئی ساحل سمندر کی طرف روانہ ہوئی۔ جب پروشین "اژدر" (فریڈرک) کو پتہ چلا کہ یہ دونوں صحیح وسلامت ایڈنبرا پہنچ چکے ہیں تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ لیکن یورپ بھر میں کارل شرز کے اس کارنامے کے چرچے تھے۔

اس حریت پسند نوجوان جنرل کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لیے ابھی بہت دور جانا تھا۔ اسے امریکی سیاسی زندگی میں اپنے جوہر دکھانے تھے۔ شروع شروع میں تو اسے یہ اعتماد تھا کہ لندن میں بیٹھ کر پناہ گزینوں اور تخیل پسندوں کی مدد سے مادر وطن میں انقلاب برپا کیا جا سکے گا۔ چنانچہ اس نے وہاں تین سال اسی موہوم امید میں گزار دیئے۔ لندن میں اس کی ملاقات ایک اٹھارہ سالہ لڑکی مارگرتھ ہیٹیر سے ہوئی جس کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی آنکھیں اتھاہ صداقت سے معمور ہیں۔ شرز کی پرجوش ہیجان خیز رجائیت کے ساتھ ساتھ اس کی ایک خوبی مردم شناسی بھی تھی، اور اس کا انتخاب ہمیشہ بے خطا ہوتا تھا۔ چنانچہ اپنی دلہن کے طور پر کارل شرز نے ایک ایسی عورت کو منتخب کیا جس سے وہ عمر بھر محبّت کرتا رہا۔ اس لڑکی کا باپ ہیمبرگ کا ایک امیر یہودی کارخانہ دار تھا۔ اسے یہ بات قطعاً پسند نہ تھی کہ اس کی بیٹی ایک ایسے قلاش انقلابی سے اپنی قسمت وابستہ کرلے جو اپنے وطن لوٹنے کی کبھی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن ہر رکاوٹ کے باوجود یہ نوجوان جوڑا جس کے عزائم اتنے ہی بلند تھے جتنی گہری ان کی محبت تھی امریکہ کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں آزادی کی روشنیاں کارل شرز کو دعوت دے رہی تھیں۔

جب وہ نیو یارک پہنچا تو کارل شرز انگریزی سے نابلد تھا، لیکن چند ماہ کے اندر ہی اس نے یہ زبان سیکھ لی، اور وہ شیکسپیئر اور بلیک سٹون کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس مُلک کا شہری بننے کی تیاری کی غرض سے وہ واشنگٹن روانہ ہوا جہاں اس نے کانگریس، سیاسی پارٹیوں اور قائدین کا مطالعہ کیا۔ اس

کے بعد وہ امریکہ کے شہروں کی سیر کرنے کی غرض سے گیس لائٹ کے لمپوں کا سیلز مین بن کر نکل پڑا۔

سنسنیاتی، شکاگو، سینٹ لوئی اور ہوائی میں کئی جرمن بستیاں تھیں اور ہر جگہ بستیوں میں اس چمک دار بھوری آنکھوں والے نوجوان کا ایک ہیرو کی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ اس کی گرجدار آواز مقرر کی حیثیت سے اس کی خداداد خطابت، مجمع پر چھا جانے کی صلاحیت اور پُرخلوص شخصیت نے اسے ری پبلکن پارٹی کے لیے جیسے نعمت غیر مترقبہ بنا دیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے وہ اس مرتبے پر پہنچ گیا کہ جرمن نژاد امریکیوں کے ووٹ اس امیدوار کے حق میں جاتے تھے۔ جس کی وہ تائید کرتا تھا۔ اس دور میں وقت کا اہم ترین متنازعہ فیہ مسئلہ غلامی کا رواج تھا اور کارل نیگرو غلاموں کی آزادی کا علمبردار بن گیا۔

چند ماہ کے مطالعہ کے بعد اس نے قانون پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ اسے وکالت کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس نے وکالت کبھی کی نہیں اور اس کی بجائے اس نے سب سے پہلے اخبارات کے ذریعہ اپنی قائدانہ قوتوں کا لوہا منوانے کی طرف توجہ دی۔ اس نے وسکانسن میں جرمن زبان کا ایک اخبار جاری کیا۔ صحافت میں اس کی دلچسپی خبریں جمع کرنے میں نہیں بلکہ اداریہ نویسی میں تھی۔ یہ گویا اس کے پرچم تھے اور زندگی بھر وہ انہیں جرمن اور انگریزی زبانوں میں سینٹ لوئی، ڈیٹرائٹ، نیویارک اور دوسرے مقامات پر لہراتا رہا۔

اس ملک میں اپنے ورود کے آٹھ سال کے اندر وہ نیویارک

کے لفٹیننٹ گورنر کے عہدے کے لیے انتخاب لڑ رہا تھا۔ وہ صرف ۸۰ ووٹوں سے الیکشن ہار گیا۔ الیگزینڈر ہملٹن کے سوا اور کسی پردیسی نے امریکی سیاست میں شاید ہی اس سرعت کے ساتھ رسوخ حاصل کیا ہو اور نہ ہی امریکی سیاست بھی کبھی اتنے شدید بحران سے دوچار ہوئی تھی جس کا آغاز غلامی کے مسئلہ پر لنکن اور ڈگلس کے مباحثے سے ہوا تھا۔

شرز نے اپنا تن من اس مہم میں لگا دیا، اور اس نے غالباً اتنی تقریریں کیں جتنی لنکن اور ڈگلس دونوں نے مل کر کی تھیں۔ اس سفر کے دوران میں ایک لب راہ جنکشن پر اس نے ایک شخص کو بارش میں اپنا انتظار کرتے پایا۔ یہ دبلا پتلا شخص ایک پرانا چھاتہ لگائے ایک ہاتھ میں ٹوٹا پھوٹا سوٹ کیس تھامے سر پر اونچا ہیٹ رکھے اور شال اوڑھے کھڑا تھا۔ یہ ابراہام لنکن تھا جو اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ بعد میں ایک مرتبہ لنکن نے اس کو بتایا۔ میری اور تمہاری جتنی شناسائی ہے اتنی شناسائی کا کوئی اور شخص میرے دل سے اتنا قریب نہیں ہوا جتنا تم ہو۔ یہ ایک ایسی دوستی کا آغاز تھا۔ جس کے باعث شرز کو بار بار وہائٹ ہاؤس آنا جانا پڑا۔ عام طور پہ وہ کوئی مشورہ دینے کے لیے وہائٹ ہاؤس جاتا، اور وہائٹ ہاؤس کے پیانو پہ جنگ سے بیزار پریسیڈنٹ کو بیتھوون اور موزارٹ کے نغمے سنایا کرتا تھا۔

جس کنونشن میں لنکن کو صدارت کا امیدوار نامزد کیا گیا۔ شرز ہی نے اس قرارداد کی تائید کی تھی کہ نامزدگی متفقہ ہونی چاہیے۔ یہ قرارداد بآواز بلند منظور کر لی گئی۔ الیکشن کی مہم کے دوران میں رات رات بھر بڑے بڑے اجتماعات

کو مخاطب کرنے میں اس نے ڈینیل ویبسٹر تک کا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا۔ وہ ری پبلکن پارٹی کا سب سے بڑا خطیب بن گیا اور اس نے جرمن نژاد امریکنوں کے ووٹ تو لنکن کو لاکر دیئے ہی تھے۔ لیکن اور بھی ہزاروں ووٹ اسی کی بدولت حاصل ہوئے۔ اس کے باوجود جب کامیابی نصیب ہوئی تو شرز نے اس کا کوئی صلہ، طلب نہیں کیا۔ اس نے کہا کسی عہدے کے لیے درخواست کرنا اس کی ضرورت سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے مترادف ہے۔

درخواست کیے بغیر ہی صلہ یوں ملا کہ اسے میڈرڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔ وہ لمحہ یقیناً فخر و مباہات سے پُر تھا، جب یورپ کی سب سے زیادہ رجعت پسند حکومت کے سامنے اس شخص نے اپنے اسناد تقرری پیش کیے۔ جو رجعت پسندوں ہی کے انتقام سے بچنے کے لیے یورپ سے بھاگ آیا تھا لیکن خانہ جنگی کے آغاز میں جو تباہیاں ہوئیں انھوں نے شرز کی سپاہیانہ صلاحیت کو اکسا دیا۔ میڈرڈ میں اس نے فن حرب کے مطالعہ کو پھر تازہ کیا اور خود اس کی درخواست پر اسے سفارتی عہدہ سے مستعفی ہونے کی اجازت دی گئی۔ اور بریگیڈیر جنرل کا رتبہ حاصل کرنے کے بعد اس نے جرمن، امریکی رضاکاروں کا ایک لشکر تیار کرنا شروع کر دیا۔

بُل رن کی دوسری لڑائی میں چانسلرز ویلے اور گٹسبرگ میں لی نے حملوں کے جو مقامات مخصوص کیے تھے ان پر شرز کے بریگیڈ ہی متعیّن کیے گئے۔ گٹسبرگ میں پہلے ہی دن چند گھنٹوں میں شرز کی کمان کے نصف سے زیادہ آدمی کھیت رہے اور اسے پیچھے شہر کی طرف دھکیل دیا گیا۔ جنرل شرز کا اپنا

گھوڑا گولی لگنے سے اس کی ران کے نیچے ہی ہلاک ہو گیا۔ تیسرے دن اس کی رجمنٹوں کو یہ حکم ملا کہ پکٹ کے حملے سے پہلے توپ خانے نے جو زبردست باڑ ماری شروع کی تھی اس کے نیچے خاموشی سے لیٹ جائیں اور اس موقعہ پر اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے شرز نے ایک سگار سلگایا اور اپنی صفوں کے سامنے بڑے سکون کے ساتھ ٹہلتا رہا۔

جب جنگ ختم ہو گئی اور وہ دوبارہ سیاسی زندگی میں داخل ہوا تو شرز نے جنرل کا خطاب ترک کر دیا اور اپنی جنگی خدمات کا سہارا لینے سے انکار کر دیا۔ امریکی یونین کے کسی لیڈر کی طرف سے جنوبی ریاستوں کے بارے میں ایسے فیاضانہ طرز عمل کا مظاہرہ نہیں ہوا جیسا شرز نے اختیار کیا۔ جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ جیفرسن ڈیوس کے مقدمہ کی سماعت ایک خفیہ فوجی ٹریبونل کرے تو شرز نے ایسے غیر امریکی طریق کار کے خلاف احتجاج کیا اور اس طرح غالباً اس نے ملک کو اپنے ہاتھوں رسوا ہونے سے بچا لیا۔

۱۸۶۹ء میں جب وہ مسوری سے سینیٹر منتخب ہوا تو اس نے عفو و درگزر کی بنیاد پر یونین میں جنوبی ریاستوں کی دوبارہ شمولیت کے لیے تگ و دو کی۔ نیگروؤں کے لیے شہریت کے مکمل حقوق کی وکالت اور کوکلس کلان سے نفرت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس نے ورجینیا، لوزیانہ اور جنوبی کیرولینا سے فوجی حکومت برخاست کرنے کا بار بار مطالبہ کیا، اور اس نے کچھ کامیابی بھی حاصل کی۔ غالباً عوامی منصب پر فائز کسی امریکی نے جنوب کی پُرامن تنظیم جدید کے لیے شہید لنکن کے نصب العین اور مقاصد کو پوری طرح روبکار لانے میں شرز سے

زیادہ کوشش نہیں کی ہو گی۔

سینٹ میں شرز نے شراب بندی کی مخالفت کی اور سب سے زیادہ اسی نے گرانٹ کی سازش کو ناکام بنانے میں مدد دی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سانٹو ڈومینگو کی ری پبلک کو الحاق کے ذریعہ ختم کر دیا جائے۔ اس نے چینیوں کو امریکی شہریت سے محروم رکھنے کے خلاف تنہا صدائے احتجاج بلند کی اور ہر اس اقدام کی مخالفت کی جس کا مقصد تارکین وطن پر پابندیاں عائد کرنا تھا جو حقیقت میں امریکہ کے مستقبل کے شہری تھے۔

امریکی سیاست میں کوئی دور ایسا نہ آیا جس میں اس دور سے زیادہ بدعنوانیاں ہوئی ہوں اور شرز بڑی بے باکی اور جسارت سے جعل سازی کو بے نقاب کرتا چلا گیا۔ اور اِس کے لیے بعض اوقات اُسے اپنی ہی پارٹی کے بڑے بڑے عمائدین کے چشمکی لینی پڑی۔ کاغذی سکّہ رائج کرنے اور اس طرح اندھا دھند افراطِ زر پیدا کرنے کی سکیم کے خلاف ٹھوس زر کی حمایت میں شرز کے دلائل مسکّت ثابت ہوئے۔ کانگریس کے ارکان بے سود چلّاتے رہے کہ یہ شخص محض ناقابلِ عمل خواب دیکھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ایک خیالی پلاؤ پکانے والا تصوّر پرست اب ایک عملی آدمی بن چکا تھا، اور جو جاسوس اس نیّت سے اس کے پیچھے لگائے گئے تھے کہ اس کے خلاف کسی تباہ کُن سکینڈل کا سراغ لگائیں، وہ خالی ہاتھ ہی اپنے آقاؤں کے پاس لوٹ آتے۔

اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سِول سروس کی اصلاح ہے۔ اس زمانے میں ہر قسم کی سرکاری ملازمتیں گویا سیاسی تر نوالہ تھیں اور اکثر

قابلیت کی اساس پر نہیں بلکہ جماعتی حمایت کی بنا پر دی جاتی تھیں۔ یہ تصوّر کر لیا گیا تھا، اور اس رائے سے صدر جمہوریہ بھی متفق تھے کہ سیاسی زندگی مالِ غنیمت کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ سینیٹر شرز کے اصرار سے مجبور ہو کر گرانٹ نے بالآخر سِول سروس کے انتخاب کے لیے بادلِ ناخواستہ مقابلہ کے امتحان کا طریقہ رائج کیا۔ صدر کے بعد صدر آتے رہے لیکن ہر صدر کو پہلے سے زیادہ طاقت ور شرز اور اس سے کہیں زیادہ طاقت ور اور شرز کی بیدار کی ہوئی رائے عامہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سِول سروس کی بتدریج اصلاح بڑی حد تک اس وقت سے ہوئی جب کارل شرز ہر پریذیڈنٹ کے ہاتھ میں جھاڑو، اور بالٹی تھما کر صفائی پر مجبور کر دیتا تھا۔

پریذیڈنٹ ہیس کے تحت شرز وزیرِ داخلہ بنایا گیا۔ محکمہ اور کاروباری طبقہ دونوں ہی یہ سمجھتے تھے کہ عوامی عملداری کے محکمہ کی تھیلی کا منہ ہر اس ڈاکو کے لئے کھُلا رکھنا چاہیے جو اس تک پہنچنا اور جیبیں بھرنا چاہے۔ لیکن شرز نے اس تھیلی کی حفاظت ایک جاگتے ہوئے شیر کی طرح کی اور پھر الکیس کے دور تک "سب سے زیادہ قابلِ نفریں وزیرِ داخلہ" کا خطاب حاصل کرتا رہا۔ اس نے نکھٹوؤں کو چُن چُن کر نکال باہر کیا اور پارٹی کی پروا کیے بغیر قابل لوگوں کو کام پر لگایا۔ "لعنت ہو اس شخص پر" پوسٹ ماسٹر جنرل نے جل کر کہا تھا۔ "وہ تو اپنے محکمے کو ایک کاروباری ادارے کی طرح چلا رہا ہے۔"

محکمہ داخلہ کا رِسنے والا ناسور، سدا سے، سرخ ہندیوں کا شعبہ رہا ہے۔ شرز کے پیش رووں اور محکمہ جنگ کی بدنظمی نے پونکا قبیلے کو آمادہ

پیکار کر رکھا تھا۔ شرز پچھلی روایات کو توڑ کر بنفس نفیس ان کے مختص علاقوں کا دورہ کرنے گیا تاکہ خود تفتیش کرے وہ نہ صرف ان قبائل کو مطمئن کر کے لوٹا بلکہ چچا سام اور ان کے سُرخ بھائیوں کے صدیوں کے تعلّقات میں پہلی بار وہ سرخ ہندیوں کے دلوں کو اعتماد سے پُر کر کے آیا۔ سُرخ ہندیوں کے پیشہ ور ایجنٹوں کی بجائے اس نے ہندیوں کی اپنی پولیس منظّم کی تاکہ وہ اپنے قبائل میں نظم و ضبط قائم کریں اور سول سروس میں بھی سرخ ہندیوں کے معاملات سے نمٹنے کے لیے انہی کے آدمی بھرتی کیے۔ اس پر پیشہ ور ہندی ایجنٹ بڑے چراغ پا ہوئے اور سرخ ہندیوں کے لیے جو علاقے محفوظ کر دیئے گئے تھے، جب ان علاقوں کے نوجوان اپنے آپ کو امریکی زندگی کے سانچے میں نہ ڈھال سکے تو شرز نے پنسلوینیا میں ویران بیرکوں کو سرخ ہندیوں کے لیے ایک صنعتی سکول میں تبدیل کر دیا۔ یہ گویا کارلائل انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد تھی۔

محکمۂ داخلہ کے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد شرز نے پھر کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا بلکہ اس نے ادارت جنگلات کے تحفظ اور اپنے مشغلوں یعنی مطالعۂ قدرت اور موسیقی کی طرف اپنی تمام تر توجہات منعطف کر دیں لیکن لنکن سے تھیوڈور روزویلٹ تک امریکی تاریخ کے طویل دَور میں کارل شرز ہر حکومت کے ضمیر کا چوکیدار تھا۔ جب کبھی سیاسی جماعتیں اپنا اصول تبدیل کر لیتیں۔ جیسا کہ ان کا دستور ہے کہ وہ اعتراف کیے بغیر پٹڑی بدل لیتی ہیں تو شرز فوراً ہی اس کا پتہ چلا لیتا۔ وہ اپنی پارٹی تبدیل کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اپنا اصول کبھی تبدیل نہ کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ میرا ملک بہر حال مقدم ہے خواہ وہ راستی پر ہو

یا غلطی پر۔ اگر راستی پر ہے تو اسے راستی ہی پر رکھنا ہے اور اگر غلطی پر ہے تو راستی پر لایا جائے۔

شرز کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ اس کے جنازے کو جوزف ایچ کوئیٹ، اینڈریو کارنیگی، چارلس فرانسس ایڈمز، فلکس ایڈلر اور رچرڈ واٹسن گلڈر نے کندھا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے ناموری حاصل کی جس نے امریکی سیاسیات کو آلائشوں سے پاک کر دیا۔ بلاشبہ وہ سب سے بڑا جرمن نژاد امریکی تھا۔ وہ ایک مزارع کی بیٹی کے ہاں پیدا ہوا۔ وہ ایک نیک جرمن تھا اور ہمیں توقع ہے کہ آج اس شکست خوردہ قوم سے دوبارہ ایک ایسا ہی فرزند پیدا ہوگا۔



جوزف لی

کھیلوں کا سرپرست

پولیس کے سپاہیوں کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ شہر کے بچوں کو سڑکوں اور گلیوں میں گیند کھیلنے کی پاداش میں گرفتار کر لیتے تھے۔ ان کی رائے میں بچوں کے کھیل کود ٹریفک میں رکاوٹ بنتے تھے اس لیے سڑکوں پر کھیلنے کی قانوناً ممانعت تھی۔ یہ بات ۱۸۹۰ء کی ہے۔ ان دنوں بوسٹن کے جج کا بھی یہ معمول تھا کہ وہ ان بچوں کو سزا دیا کرتا تھا۔ لڑکے بے چارے ایک ایک سے پوچھا کرتے، ہم سکول کے میدان میں نہیں کھیل سکتے ہمیں سڑکوں پر کھیلنے کی اجازت نہیں۔ اگر ہم اپنے محلے کے کسی احاطے میں کھیلتے ہیں تو سپاہی ہمیں وہاں سے بھگا دیتا ہے۔ پھر ہم آخر جائیں کہاں ——؟

لیکن عام طور پر پولیس اور عدالتیں سوالات کیا کرتی ہیں۔ ان کے جواب نہیں دیا کرتیں۔ اِدھر کسی نے زبان کھولی اُدھر جج نے میز پر ہتھوڑا مار

کر اسے خاموش کر دیا۔ اگر ان بچّوں کے والدین جرمانہ ادا نہ کر سکتے تو انہیں بڑی عمر کے مجرموں کے ساتھ ہی جیل بھیج دیا جاتا۔

اخباری رپورٹروں کے لیے بھی اس قسم کے واقعات پر روزانہ ایک پانچ سطری خبر دینا معمول میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن قدرت بچّوں سے محبت کرتی ہے اور غالباً یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ ایک روز اخبار کی یہ سطور بیگن ہل کے ایک امیر گھرانے کے شہری کی نظر سے گزریں اور وہ غصّے کے مارے اخبار پھینکتے ہوئے چلّا اٹھا۔ یہ گرفتاری کیوں، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان بے چارے بچوں کو زندہ رہنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ جوزف لی ایک ایسا شخص تھا جس کے خیال میں ایسی باتوں پر ہمیشہ تاؤ کھانا چاہیئے جو غصّے کی مستحق ہیں۔ اور غصّہ کے اس جذبے کو ایک قوّت محرکہ کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ وہ سیدھا بوسٹن کے ساؤتھ بے محلّے میں پہنچا۔ تاکہ اپنی آنکھوں سے ان گندے، میلے بچّوں کو کھیلتا دیکھے۔ یہ نٹ کھٹ بچے طرح طرح سے اپنا دل بہلاتے تھے لیکن ایک ایسے مقام پر جہاں جائے تنگ است و مردماں بسیار، کے مصداق ایک ایکڑ کے محدود رقبے میں اوسطاً آٹھ سو اشخاص کو کام کاج کرنے، اٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے جینے، مرنے، غرض دنیا کے تمام بکھیڑے پورے کرنے ہوں، وہاں کسی قسم کی قدرتی اور صحت مندانہ تفریح عملاً ناممکن تھی اور کھیل کے لیے جو جگہ میسّر ہو سکتی تھی وہاں سے قانون کا ڈنڈا بچّوں کو مار بھگا دیتا تھا۔ مگر ان لڑکوں کا ایک دوسرے کو دھمکانا، ٹولیاں بنا کر لڑنا، آوارہ گردی کرنا، گھر سے باہر مارے مارے پھرنا۔ گلی کوچوں میں جنسی معلومات حاصل کرنا، عریاں کھیل تماشے دیکھنا اور آدھی

آدھی رات یا صبح تک روشنی کے کھمبوں پر پھسلتے رہنا قانون کے خلاف نہ تھا۔

جوزف ٹی کو اپنا خوش گوار بچپن یاد آگیا۔ جب اسے کھیل کود کی ساری سہولتیں میسّر تھیں۔ اس کا باپ بوسٹن کا سب سے معزز شہری تصوّر کیا جاتا تھا اور اس کا شجرہ نسب بوسٹن کے اعلیٰ ترین خاندانوں سے ملتا تھا۔ اس کا بچپن معصوم تفریحات کا گہوارہ یا پرستان تھا۔ وہ پبلک رنک پر جایا کرتا۔ رقص میں حصہ لیتا۔ چاندنی رات میں سکیٹنگ یا کشتی رانی کی پارٹیوں میں شریک ہوتا۔ برف پوش پہاڑیوں پر پھسلتا، ساحل سمندر پر تیرا کرتا، دوڑ بھاگ کے کھیلوں میں حصّہ لیتا۔ پھول توڑتا، خوش الحان پرندوں کے چہچہے سنتا یا پھر آتشدان کے کنارے کہانیاں سنا کرتا۔ اس کے لیے چیستان یا فٹ بال یا بیس بال ٹیم میں شمولیت کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں وہ کوئینسبری کے ضوابط کے مطابق باکسنگ کے ذریعہ دل کے حوصلے نکالتا۔ لڑکیوں کے بارے میں اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ شریف النسب خواتین کی صحبت کے سبب تھیں۔

تاہم اس امیر زادے کی طبیعت میں کسی قسم کی تنگ مزاجی کو دخل نہ تھا۔ یوں تو اس کا یہ نفیس قدیم شہر ایسے خوش خصال اور نیک طینت لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو شہر کے آئرستانی پرتگیزی اور اطالوی باشندوں کے بارے میں یہ یقین رکھتے تھے کہ کیا بڑے اور کیا بچے، سب کے سب پیدائشی طور پر بدخصلت واقع ہوئے ہیں۔ لیکن جوزف ٹی بچوں کا دلدادہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا" ہمارے شہر کا نقشہ بناتے وقت بچوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہر بچے کو اپنے کھیل کود کے لیے ایک جگہ ملنی چاہیے۔ ایسا بچہ جسے کھیل و تفریح کے لیے کوئی میدان میسّر نہ

ہو۔ ایک ایسے شخص کی مانند ہے جس کے پاس کوئی کام کاج نہیں، اور وہ بچہ جسے کھیل کود کے لیے خراب میدان ملے وہ ایسے شخص کی مانند ہے جس کو مصروف رکھنے کے لیے کام تو ہے لیکن ایسا کام جو نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ یہ چھریرے بدن کا طویل قامت شخص جو تیس بتیس کے پیٹے میں تھا اور جو ایک پھلتے پھولتے خاندان کا سربراہ بھی تھا۔ اس بات سے خوب واقف تھا کہ بچوں کو کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان بچوں کی ان ضروریات کو پورا کر کے ہی رہے گا۔ اس تلخ حقیقت نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی کہ اس مُلک کے کوئی ایک کروڑ بیس لاکھ بچوں کے لیے گندہ گلیوں، شہر کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور خطرناک سڑکوں کے سوا کھیل کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، نہ ہی اس امر سے وہ جی ہار بیٹھا کہ اس کے سوا اس مُلک کا کوئی شخص اس انداز سے نہ سوچتا تھا کہ کھیل تعلیم، کا ایک اہم جزو اور جسم و روح کا ایک اہم فعل ہے۔

اپنے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے پتہ چلایا کہ اس شہر کے نصف سے زائد خاندان اس کے نصف سے بھی کم رقبے پر رہائش پذیر ہیں۔ ان کے مقابلے میں مُردے قبرستانوں میں زیادہ آرام سے سو رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ قدیم طرز کے سِٹی پارک ایسی جگہ پر واقع نہ تھے جہاں ضرورت مند اُن سے استفادہ کر سکتے۔ پھر وہاں ہمیشہ ایک افسر متعین رہتا تھا جس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ بچوں کو گھاس کے قطعات سے پرے رکھے۔

جوزف لی ایک ایسی گلی میں پہنچا جہاں اس کے سماجی مرتبہ کے لوگ کبھی قدم نہ دھرتے تھے۔ یہاں اس نے زمین کا ایک خالی قطعہ مستعار لینے کی

اجازت حاصل کی۔ پھر اس نے یہاں سے انتہائی خطرناک قسم کا کوڑا کرکٹ صاف کرانا شروع کیا۔ مگر اس نے دانستہ طور پر وہ چیزیں چھوڑ دیں جن کو بچے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ جیسے خالی ڈبے، تختے، گھروندے بنانے کے لیے ریت، ہموسے بنانے کے لیے چکنی مٹی، قلعے اور گڑیا کے گھر بنانے کے لیے صندوقچے، اینٹوں کے ٹکڑے، نلکوں کے ٹکڑے، پرانے تختے جن پر سے بچے پھسل سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے بچوں کو بلایا اور کہا، آج سے تمہارے کھیل کا میدان یہ ہے۔

بچے اس میدان پر اچھلتے کودتے اور شور مچاتے ٹوٹ پڑے۔

ان کا جذبۂ احسان مندی ایسا تھا کہ ان کو دیکھ کر اور بھی ترس آتا تھا۔ لیکن لی دور کھڑا یہ دیکھتا رہا کہ ان بچوں کو ابھی کیا کیا سیکھنا ہے، جب تک باقاعدہ کھیل شروع نہیں کیے جاتے۔ ان کی آپس میں مار کٹائی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ بڑی عمر کے بچے اپنے سے چھوٹے کو تنگ کرتے تھے۔ جب لڑکیاں جھولا جھولتیں یا پھسلتیں تو بڑی عمر والیاں چھوٹی لڑکیوں کو دھکیل دیا کرتیں یا نیچے گرا دیتیں۔ اس نے محسوس کیا کہ کبڈی کے لیے گنجائش نکالنے کی ضرورت تھی اور ایک ایسے وسیع اور مکمل میدان کی ضرورت بھی جہاں کبھی فٹ بال اور کبھی بیس بال کھیلا جا سکتا۔ گرم موسم کے لیے سائبان کی ضرورت تھی۔ تیز دھوپ کے دنوں میں یہ میدان ویران پڑا رہتا اور بچے تاریک گلیوں کے ٹھنڈے سایوں میں دوبارہ جوئے بازی، سگریٹ نوشی، جنسی سرگرمیوں اور ٹولیاں بنا کر لڑائی لڑنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ بچے امیر گھرانے کے لاڈلوں کی طرح یہ نہیں جانتے تھے کہ کیسے کھیلنا چاہیے۔ انہیں اس کے سکھانے کی ضرورت تھی۔

بچّوں کو بھی بھلا کھیلنا سکھایا جائے ؟ ———— مجلس قانون ساز کے ارکان اور نخوت پسند والدین مغرور متخیر حضرات اس خیال ہی پر قہقہے لگانے لگے۔ اس کے بعد جوزف لی نے اپنی زندگی کے اگلے پچاس سال ان لوگوں کو یہ سمجھانے ہی میں صرف کر دیئے کہ بچّوں کا کھیل کود دراصل ان کا کام کاج ہے اس نے ان لوگوں کو بتایا کہ کھیل اور نشو و نما ایک ہی چیز ہے۔ بچّہ اپنے حوصلے اور قوّت برداشت کی انتہا تک اپنے آپ کو کھیل میں گم کر دیتا ہے۔ وہ جب گیند کے پیچھے بھاگتا ہے تو دراصل اپنے کردار کے ان گمنام گوشوں تک پہنچتا ہے جو اس کی شخصیّت میں مضمر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر شام کو پہلے سے کہیں زیادہ اخلاقی پختگی حاصل کر کے گھر لوٹتا ہے۔

اور بوسٹن کے جنوبی محلے میں لی غریب لڑکوں کو ان کا وہ ورثہ لوٹاتا رہا جو اس شہر نے اپنی ترقی کے دوران میں ان سے چھین رکھا تھا۔ جب ضروریاتِ زندگی تیار کرنے والی ایک کمپنی نے اس قطعہ زمین کو کرائے پر لے لیا جس پر اس کا اور اس کے شہر کے لڑکوں کا صرف خانہ بدوشوں کا سا حق تھا تو اس نے ایک ملحقہ زمین پر اپنا تجربہ شروع کر دیا۔ اس نے ۱۸۹۸ء کے سرما میں کھیل کے ایک اور میدان کو اس کے ساتھ ملا کر اس قطعہ کو وسیع کر دیا لیکن بعض سیاسی مشکلات کے سبب اسے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ چنانچہ اس نے جھولے، پھسلنیں، ریت کے تودے اور گیند کھیلنے کے میدان کو لمبس ایونیو میں قائم کیے جو شہر کا سب سے اجاڑ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک گوشہ چھوٹے بچوں کے لیے سنورنے لگا۔ بڑے لڑکوں کے کھیلوں کے لیے ساڑھے تین ایکڑ کا میدان تیار ہو گیا۔ ۲۶۰ بچّوں کی اپنی الگ

الگ کیاریاں بن گئیں اور پھر ٹی نے میسا چوسٹس کے طویل سرمائیں درونِ خانہ کھیلوں کے لیے دو پرانے اصطبل حاصل کر لیے۔ ان اصطبلوں میں بچے باسکٹ بال کھیلتے تھے۔ باؤلنگ کے لیے انھوں نے خود ہی نالیاں بنائیں اور ایک کلب بھی قائم کر لیا۔ ٹی ان کی تمام سرگرمیوں کا حیات بخش جزو تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے اردگرد ایسے نوجوانوں مردوں اور عورتوں کو جمع کر لیا جو کھیل کے میدان میں رہنما کے فرائض انجام دیتے تھے اور دن بھر محنت مزدوری کرنے والے لڑکوں کی خاطر رات کو بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

امریکہ کے کسی بڑے شہر میں موسم گرما میں اوسطاً تین سو لڑکے "چھیننے" کے جرم میں گرفتار کیے جاتے تھے اور کسی جگہ بھی جوزف ٹی کے کھیل کے میدانوں جیسا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اِدھر اُدھر کہیں نہ کہیں کسی کلیسا کے کارکن یا کسی پادری یا کسی دردمند مدرس نے بھی اسی نوع کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ کوششیں نیز تگے سے آگے نہ بڑھتی تھیں۔ ان لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ربط قائم نہیں تھا۔ ایسے میدان زیادہ تر خشک، بنجر، گندے، گھاس یا سائے کے بغیر ہوتے تھے۔ جن میں سامان وہ ہوتا تھا جسے طاقتور لڑکے ہی استعمال کر سکیں اور جہاں زیادہ سے زیادہ جرمن طرز کی جمناسٹک ہی کی جا سکتی تھی۔ لیکن جوزف ٹی کے سینے میں بچے کا دل تھا اور وہ ہر چیز کو بچوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا۔ چنانچہ اس نے بچوں ہی کی دنیا تخلیق کی۔ کھیل کود کے دوسرے مقامات اپنے دروازے پانچ بجے بند کر دیتے لیکن ٹی کے کھیل کے میدان کھلے رہتے۔ جب سرمائیں دوسروں کے تفریحی مراکز بند ہو جاتے تو ٹی کے مراکز

سرمائی عمارتوں میں منتقل ہو جاتے۔ جمناسٹک ڈرل کی مشق عام طور پر اتنی منضبط ہو جاتی جیسے بچوں سے کوئی کام لیا جا رہا ہو۔ مگر لی جانتا تھا کہ کھیل صحیح معنی میں کھیل اور بچوں کے کھیل ان کے لیے ایسی ہی اہمیت رکھتے ہیں جیسی فن کار کے لیے فن، اور سائنس دان کے لیے تحقیقات ـــــ لہٰذا پھلتے پھولتے بچوں کا سب سے بڑا کام ہی کھیل ہے۔ چنانچہ اس ساحر کی بنسی پر بچے جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ پہلے صرف ایک چھوٹی سی ٹولی آئی۔ پھر ایک مجمع لگا اور پھر شہر کے گندے اور خطرناک علاقے کے ہر کونے اور ہر گوشے سے ہزاروں بچے جمع ہونے لگے۔

لی نے جس قسم کے کھیل کے میدان تیار کیے تھے وہ اس وقت کے معاشرتی کارکنوں کے لیے بالکل ہی نئے تھے۔ جین ایڈمز، ورزش جسمانی کا عظیم ماہر لوتھر گولک اور "باقی زندگی کیسے بسر کرتے ہیں" کا مصنف جیکب راٹس، ان سب نے یہ بات تسلیم کی کہ اس پختہ عمر کے بوڑھے بچے، اس وہمی خلوت پسند نوجوان نے جس کے لبوں پر کپلنگ کی سی بھاری بھاری مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں، دنیا کو ایک صحیح خیال بخشا ہے اور اس کا یہ نظریہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا گیا۔ بوسٹن کے بعد شکاگو آگے بڑھا اور کھیل کود کی اس تحریک کا پیش رو بن گیا۔ اس وقت جب لی بوسٹن کے میئر کو تنسی کے ساتھ مل کر کھیل کے میدانوں کے حق میں بلدیہ سے قانون منظور کرانے کی جد و جہد کر رہا تھا۔ شکاگو ایسے میدانوں کے ایک وسیع نظام پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا تھا۔ یعنی شہر کے اطراف و اکناف کھیل کے چھوٹے چھوٹے میدان بڑے بڑے بلدیاتی تفریحی مراکز، چمن بندیاں، جہاں کوئی شخص گھاس پر چلنے سے منع نہیں کرتا تھا، پبلک کے لیے گولف کے میدان اور ٹینس کے کورٹ

جن کے بارے میں کبھی کسی نے نہ سنا تھا، ظہور میں آنے لگے۔ پھر فلاڈلفیا، پٹسبرگ اور بالٹی مور، اور سانفرانسسکو، نیو ہیون اور پراویڈنس، اسی روش پر چلنے لگے، شکاگو کا ہل ہاؤس اور نیو یارک کے ہنری سٹریٹ سٹلمنٹ نے اپنے ہاں کے کھلے قطعات، چھتوں اور تہ خانوں کو کھیل کود کے مراکز میں تبدیل کر دیا۔ بوسٹن میں جب لی اور کمیونٹی سروسس نے بچّوں کو کھیل کی دعوت دی، اس وقت ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ لیکن نو سال کے عرصے میں یہ تعداد سولہ ہزار دو سو مسرور و شاداں بچوں تک پہنچ گئی۔

ہر جگہ کی پولیس نے یہ رپورٹ دی کہ تفریحی مراکز کے اطراف ایک ایک میل تک کے علاقے میں بچوں کے جرائم گھٹنے لگے ہیں۔ ٹولیاں بنا کر لڑکوں کی مار دھاڑ، چوری چکاری، سڑکوں کے حادثات، ان سب میں فوری طور پر کمی ہو گئی، گرجاؤں کے کارکنوں نے لڑکوں کی اخلاقی حالت میں اصلاح کی اطلاع دی۔ سکول کے مدرسین نے بتایا کہ اب مدارس میں بچوں کی غیر حاضری گھٹ گئی ہے۔ والدین کو پتہ رہنے لگا کہ ان کے بچّے کہاں ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ جہاں ہیں محفوظ ہیں۔

اب یہ تحریک ڈیڑھ سو شہروں تک پھیل چکی تھی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جوزف لی کو قومی تفریحات کی انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ اپنی وفات یعنی سنہ ۱۹۳۷ء تک اس انجمن کے تمام اجلاسوں میں بڑی پابندی کے ساتھ شرکت کرتا رہا حالانکہ وہ بوسٹن میں رہتا تھا اور بورڈ کے اجلاس نیو یارک میں ہوا کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے اس دن بھی بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی جس

دن اس کی پہلی رفیقۂ حیات مارگریٹ ای کا انتقال ہوا جو اُس کے بچپن کی ساتھی اور زندگی بھر اس کی مددگار تھی۔ اور اس کے سیکرٹری کے سوا کسی کو بھی اس المیئے کا علم نہ تھا، جہاں سے وہ اٹھ کر فوراً ہی اس اجلاس میں آیا تھا۔

اس نے اس انجمن کو نہ صرف اپنی دولت میں سے تین لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر دیئے بلکہ دوسروں سے بھی رقوم وصول کرنے کے ناخوش گوار کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ بعض دفعہ تو بجٹ کا ۴۳ فی صد تک تنہا اس کی مساعی، اس کی رہنمائی اور اس کے اثر و رسوخ سے جمع ہوتا۔ وہ اپنے معطّیوں کو اس قسم کے دل چسپ خط لکھا کرتا تھا:

"جناب والا ....!

سال گزشتہ آپ نے ہمیں ڈیڑھ سو ڈالر روانہ کیے تھے اور اپریل میں مزید سو ڈالر آپ نے بھیجے تھے۔ اس طرح اس نظریے کے مطابق کہ جو دیتا ہے اسی سے لیا جاتا ہے، آپ سے ہمیں اس بار ڈھائی سو ڈالر وصول طلب ہیں۔"

اور اس کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جاتا تھا۔ بشپ لارنس مذاق میں کہا کرتا تھا کہ "ای اپنی باتوں کے جادو سے اس طرح آپ سے ڈالر نکلوا لیتا ہے کہ آپ کو جیب ہلکی ہونے کا احساس تک نہ ہوگا۔" اس انجمن کے لیے وہ محض سرمایہ ہی فراہم نہیں کرتا تھا بلکہ نئی نئی تجاویز بھی سوچ کر لایا کرتا تھا۔ وہ ملک گیر پیمانے پر موسیقی کے جشن منعقد کراتا۔ کرسمس کے زمانے میں سفری مذہبی ناٹک منظّم کرتا جو ایک چرچ کے بعد دوسرے چرچ میں منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ۴ر جولائی کا جشن منانے کے لیے ایسے طریقے سوچتا جو اس زمانے کے بوسٹن کے

لیے بالکل نئے تھے۔ اس نے محلّوں میں گولیوں تک کے ٹورنامنٹ کرائے۔ لٹّو گھمانے کے لیے خاص خاص جگہیں مختص کر دیں۔ چھوٹی بچیوں کے لیے کودنے پھاندنے کے میدانوں پر بھی وہ اتنی ہی توجہ دیتا جتنی بیس بال کے ٹورنامنٹ پر۔

لی بلا شبہ لڑکیوں کے اجتماعی کھیلوں کی تجویز کا بانی تھا۔ وہ اس وقت اپنے دَور سے بہت آگے کی باتیں کر رہا تھا۔ جب اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہر لڑکی کو شوخ و شنگ بننا چاہیے۔ اسے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی عادت ہونی چاہیے اور کھیل کے آداب سیکھنے چاہئیں —— اس دَور میں جب کہ ایک لڑکی کو بچپن سے عنفوانِ شباب میں قدم رکھتے ہی جلد سے جلد ایک خاتون کی سی حیثیت دینے کا رواج تھا، لی نے والدین سے یہ مطالبہ کیا کہ لڑکیوں میں بچپنے کا احساس دیر تک باقی رہنا چاہیے۔ اپنی بیوی کے تعاون سے اس نے لڑکیوں کو گھریلو کام کاج کے بے لطف دھندوں، بچوں کی دیکھ بھال اور بناوٹی شرم و لحاظ اور جمود کے چنگل سے چھڑانے کے لیے جدوجہد کی۔ اس نے اعلان کیا کہ لڑکیوں کو رقص کی ضرورت ہے۔ وہ دفتر، دوکان یا گھر کے کام کاج سے جتنا تھکتی ہیں اتنا ہی رقص کی ضرورت پڑتی ہے۔ بچپن میں گڑیوں سے کھیلنا اور پھر ڈراموں اور ناچ گانے میں دِل چسپی لینا اصل میں ایک لڑکی کی فطری نسائیت کے اظہار کا ایک جزو ہے۔ بوسٹن ان باتوں پر دم بخود ہو گیا، لیکن تھکی ماندی لڑکیاں رقص کرنے لگیں اور خوش و خرّم نظر آنے لگیں۔

عین اس وقت جب کہ بچوں کے کھیل کود کے میدانوں کی یہ تحریک ملک بھر میں پھیل چکی تھی، لی نے بالغوں کے لیے کھیل کے میدان اور

تفریحی مراکز کے قیام کی تجویز پیش کرکے سارے ملک میں ہل چل مچا دی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک شخص محض اس بنا پر کھیل و تفریحات سے کنارہ کش نہیں ہو جاتا کہ وہ اب بوڑھا ہو چلا ہے بلکہ وہ بوڑھا ہوتا ہی اسی وجہ سے ہے کہ وہ کھیلنا چھوڑ دیتا ہے۔ اسے پھر ایک بار اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی۔ گو اس میں اسے کافی عرصہ لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان کی روح کو آزاد کرانے کی کوششوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر بچوں کو آزادی بخشنے کی کوشش جاری تھی۔ بالآخر جب شہروں میں کھیل کود کے میدان بنانے کے بارے میں سارا ملک اس کی تحریک کو قبول کر چکا تو اس نے یہ مطالبہ کرکے لوگوں کو چونکا دیا کہ دیہات کے تنہا بچّے کو بھی کھیل کی سہولت میّسر ہونی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہات میں بچوں کو کھیلنے کے لیے کافی جگہ موجود ہوتی ہے، ان کو مل جُل کر کھیلنے اور نئے کھیلوں کو سیکھنے، ڈرامے دیکھنے اور موسیقی سننے کی ضرورت ہے لی نے جسمانی تربیت کے ماہرین کو احساس دلایا کہ جسمانی ورزش کے علاوہ بھی کھیل کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ دماغ کو بھی کھیل میں حصّہ لینا چاہیے۔ جذبات کا برملا اظہار اور ان کا استحکام، گہرائی اور گیرائی ضروری ہے۔

بچوں کے لیے تفریحات کے انتظام کے وسیع اور بے اندازہ کام میں مصروف رہنے کے باوجود لی نے ان بچوں کی زیادہ سنجیدہ ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ مجرم بچّوں کے لیے بالغوں کی عدالت کی بجائے ایک علیحدہ عدالت میں مقدمات کی سماعت کا مطالبہ منوانے کے لیے وہ بیس سال تک لڑتا رہا۔ برسوں کی اس جدوجہد کا نتیجہ بوسٹن میں بچوں کی عدالت کی صورت میں

ظاہر ہوا ـــــــــ؛

بہت سے ارباب ثروت ہارورڈ بورڈ آف اوورسیئرز کی رکنیت پر آسودہ خاطر تھے۔ لیکن ؔلی اس مرتبے کو اعزاز کے باوجود محض ایک نمائشی کام تصوّر کرتا تھا۔ وہ اس وقت پارٹی بازی اور سیاست زدہ بوسٹن سکول کی کمیٹی کے محاذ پہ لڑائی لڑنے میں بری طرح مصروف تھا۔ اس کمیٹی میں اس نے سرکاری مدارس کے طالب علموں کے حقوق کے لیے جد وجہد کی حتیٰ کہ اس نے موزوں، عمارتیں بھی بنوائیں اور ان کے سکولوں کے صحنوں کو کھیل کے میدانوں میں بھی تبدیل کر دیا۔ رات کے وقت اور تعطیل کے دوران میں سکولوں کو بالغوں کی تفریح کے لیے کھول دیا جاتا تھا۔ ؔلی نے ایک مذہبی جماعت "لارڈز ڈے لیگ" سے حُجّت کرکے بالآخر قانوناً یہ تسلیم کرا لیا کہ اتوار کو کھیل اور تفریح جائز ہے۔ اس نے مدرسوں کے لیے طبّی سہولتوں اور سکول کے نواح کے لیے تحریک امداد باہمی کی اساس پر نرسنگ کا انتظام کروایا۔ اس احساس کے تحت کہ سُست رو جماعتوں میں ایک محنتی اور ذہین لڑکے کا کتنا ضیاع ہوتا ہے اور ایک پست اور کمزور لڑکے کو اپنے سے کم عمر اور زیادہ طبّاع اور اچھی صلاحیتوں والے لڑکوں میں پھنسنے سے کیسی اذیّت پہنچتی ہے۔ اس نے پس ماندہ اور بیمار لڑکوں کے لیے ایسے سکول قائم کرائے جن میں طلبہ کی درجہ بندی نہیں ہوتی تھی۔

ؔلی کی یہ خواہش تھی کہ تمام بچّوں کو اچھے استاد میسّر ہوں اور صرف وہی اشخاص اس پیشہ میں داخل کیے جائیں جو پوری طرح تربیت یافتہ ہوں۔ اس کے مادر علمی میں مدرسین کی تربیت کے لیے کوئی شعبہ نہ تھا۔ چنانچہ

اس نے ہارورڈ یونیورسٹی کے روشن خیال صدر ایلیئٹ سے پوچھا "آخر یہ شعبہ کیوں نہ کھولا جائے؟" ایلیئٹ نے کہا۔ "خیال تو بہت اچھا ہے لیکن اس کے لیے فنڈز نہیں ہیں۔" اس پر لی نے جواب دیا۔ "آپ یہ شعبہ فوراً کھول دیجئے، تنخواہیں مَیں ادا کر دوں گا۔ بھلا کتنا خرچ بیٹھے گا اس پر؟" ایلیئٹ نے حساب کرکے بتایا، "آغازِ کار کے طور پر پچیس ہزار ڈالر درکار ہوں گے۔" یہ سن کر لی اپنے بینکر کے ہاں پہنچا اور بڑی لاپرواہی کے ساتھ کہا۔ "مَیں نے ابھی ابھی ایلیئٹ سے پچیس ہزار ڈالر کا وعدہ کیا ہے۔" اور پھر چوں کہ اسے کبھی اپنی جمع پونجی کا حساب معلوم نہیں رہتا تھا، اس نے یہ بھی پوچھا۔ "کیا مل جائے گی مجھے یہ رقم؟"

خوش قسمتی سے اتنی رقم موجود تھی اور اس نے ہارورڈ اسکول آف ایجوکیشن کی بنا ڈالی، اور جب تک یہ تجربات کے مرحلے میں رہا۔ لی اس کے اخراجات ادا کرتا رہا۔ اس کے باوجود لی نے کبھی کسی تقرر یا رائے یا طریق تعلیم پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صاف معاملگی اور قاعدہ قانون کے مطابق کام کرنے کا قائل تھا، اسی بنا پر اور اس وجہ سے بھی کہ وہ ہارورڈ لا اسکول کا گریجویٹ اور میساچوسٹ بار کا رکن تھا (گو اس نے کبھی وکالت نہیں کی)، لی بڑی جرأت سے اپنا مطالبہ پیش کرتا اور مرضی کے مطابق قانون وضع کروا لیتا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا ——— سیاست دانوں سے ربط ضبط قائم کرنا، مسودہ قانون کی ناکامی کا سامنا کرنا یا اس میں ترامیم قبول کرنا اور سال بہ سال اس کی تجدید کرانا۔ غرض سارا کام بڑا ہی صبر آزما تھا۔ لیکن لی نے میساچوسٹ سوک لیگ قائم کرکے سماجی بہبودی کے لیے کوئی ایک سو قوانین وضع کرائے اور

اتنی ہی تعداد میں سماج دشمن بل مسترد کرائے۔ لوگ بچوں کے ہاتھ کوکین فروخت کرتے تھے، اور بدقسمتی سے اس کی ریاست میں اس کے خلاف کوئی قانون نہ تھا۔ تاآنکہ اس نے لڑ جھگڑ کر ایک قانون منظور کرایا۔ منشیات فروخت کرنے والوں کے حق میں وہ جانی دشمن تھا۔ لیکن وہ قانون شکنوں کا مستقل دوست بھی بن سکتا تھا۔ مثلاً اپنے وقت سے بہت آگے بڑھ کر اس نے شرابیوں کے لیے نفسیاتی علاج کا، اور اچھے چال چلن کے قیدیوں کے لیے پابند ضمانت رہائی کا مطالبہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجرموں کی اصلاح کی جائے۔ انہیں محض سزا نہ دی جائے۔ سماجی کام کے بارے میں اس کا تصوّر یہ تھا کہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنایا جائے۔ محض مُردوں کی تدفین یا زخمیوں کی مرہم پٹی پر اکتفا نہ کیا جائے۔ اس ملک کے دوسرے اربابِ ثروت کے مقابلے میں آپ کچھ زیادہ دولت مند نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی دولت بھی اسی فیاضی سے خرچ کی جس فیاضی سے اس نے اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ اس کے اوّلین عطیے اور جوش و خروش کے باعث بوسٹن میں سماجی بہبود کی تحریک چل نکلی۔ جس نے باسکٹ بال اور فٹ بال ٹورنامنٹوں اور سماجی کلبوں میں بیس ہزار لڑکیوں اور پچاس ہزار لڑکوں کو جمع کرلیا۔ اس نے ہارورڈ کلب کے بھی جزوی اخراجات برداشت کیے جس میں مشہور ماہر موسیقی ڈاکٹر ڈیویسن کی خدمات کے اخراجات بھی شامل تھے۔ وہ ڈیویسن کے اس خیال کا ہمنوا تھا کہ حوصلہ بخش موسیقی عظیم تر موسیقی ہوتی ہے چنانچہ اس نے ہارورڈ گلی کلب کو باخ اور پیلسٹرینا کے شہ پاروں کا مغنّی بنا دیا اور پھر ملک میں مختلف مقامات پر کنسرٹ منعقد کرنے کے لیے کلب کے دورے میں مدد دی۔

لی جو امریکی خانہ جنگی کے دوسرے سال پیدا ہوا تھا۔ پہلی عالم گیر جنگ کے زمانے میں اپنے اثر و رسوخ کی معراج پر تھا۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں اس کے ملک کے بیس لاکھ آدمی فوج میں ہتھیار بند تھے۔ ان میں سے اکثر کیمپوں میں تھے یا محاذوں پر، ان میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے اور ان میں مشترکہ چیز ان کی نوجوانی اور کھیل کود کی طرف فطری رغبت تھی۔ اُسے برّی اور بحری فوج کے لیے ایک منظم تفریح کی اہمیت کا احساس تھا تاکہ نوجوانوں کو فرصت کے اوقات میں لڑائی جھگڑے، بیزاری، مے نوشی یا جنسی اختلاط سے باز رکھا جا سکے۔ نیوٹن ڈی بیکر اور جوزیفس ڈینیلز نے جوزف لی کو تربیتی کیمپ کی سرگرمیوں کا انچارج بنا دیا اور جس شخص نے اس کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ ایک بچے کے دلی جذبات سے کس خوبی سے واقف ہے۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ وہ نوجوانوں کے مذاق اور طبیعت کو بھی خوب سمجھتا ہے۔ جنگ کے خاتمے پر میجر جنرل کلارنس آر ایڈورڈز نے بوسٹن کے اس فرزند کو جس کی بھنویں تک اُڑ چکی تھیں، اور جس کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا، امتیازی خدمات کے تمغے سے سرفراز کیا۔

ایمرسن نے لکھا ہے کہ "ہر ادارہ ایک فردِ واحد کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔" اور قومی تفریحات کی انجمن لی کی طویل پرچھائیں تھی، اس پرچھائیں کی طوالت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس انجمن نے اپنی امداد کو جنوبی امریکہ، یورپ، اور ایشیا تک وسعت دے دی ہے۔ امریکہ میں کھیل کے میدانوں کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا، آج اگر حکومت سیام اس ایسوسی ایشن سے

بیس بال کی ٹیموں کی تنظیم کے لیے امداد کی طلب گار ہوتی ہے تو عملی طور پر اس واقعہ کے پیچھے جوزف لی کا ہاتھ کار فرما ہوتا ہے۔ یہ تحریک اب اتنی قوت پکڑ چکی ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب کہ کساد بازاری اپنی انتہا پر تھی اس ملک نے مفت تفریحات کی سرگرمیوں پر تین کروڑ ساٹھ لاکھ اٹھہتر ہزار پانچ سو تراسی ڈالر اور ستائیس سنٹ صرف کیے، گویا جو رقم پانچ سال قبل صرف کی گئی تھی اس میں سو فی صد اضافہ ہو چکا تھا۔ گو یہ صحیح ہے کہ بہت سے مخلص کارکنوں نے زندگی کو بھرپور بنانے کے ان وسائل کی توسیع میں حصّہ لیا ہے لیکن جوزف لی پہلا شخص تھا جس نے اس کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے راستہ ہموار کیا۔ وہ کوئی تربیت یافتہ سماجی کارکن نہیں تھا۔ کھیل کے میدانوں کے رہنما کی حیثیت سے بھی وہ محض ایک پُرجوش کارکن تھا۔ جیسے وہ اپنی نوجوانی کے زمانے میں کوئی مشاق کھلاڑی نہیں تھا بلکہ محض ایک زندہ دل شوقین تھا۔ لیکن اس کا زاویہ نگاہ بلند اور دوسروں کو متاثر کرنے والا تھا۔ جو لوگ اس سے ملتے وہ اچانک اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑا محسوس کرنے لگتے۔ محض اس کی لمس سے ان کی نظر، ان کا جوش، ان کا جذبہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا گویا وہ کھیل کود کا ایک سرپرست ساحر تھا۔

ستّر سال کی عمر میں بھی وہ کئی میل تک برف پر سکیٹنگ کر سکتا تھا اور وہ سکیٹنگ کا وہی جوتا استعمال کرتا تھا جو پچاس سال قبل اس نے پچاس سینٹ کے عوض خریدا تھا۔ اپنی تمام دولت کے باوجود اپنی پرانی ہیٹوں، پرانے بے آواز جوتوں اور پرانے کوٹوں سے ایک بچے کی طرح الفت رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تو نیویارک یا بوسٹن کی کسی فیشن ایبل کلب میں شامل ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی کلب

کا رُکن نہ بنا۔ اگر کسی کلب میں وہ جاتا بھی تھا تو اس خیال سے کہ اپنے منصوبوں کے لیے دوستوں کی امداد حاصل کرے۔ کوہیسٹ کے ساحل پر اس نے ایک مختصر سا مکان اس بات کا خیال رکھ کر کرایہ پر لیا کہ وہ پڑوسیوں سے زیادہ سے زیادہ قریب رہے۔ وہ ہر عمر کے لوگوں سے گھُل مل جاتا تھا۔ کبھی تو وہ اپنے گھر کے برآمدے میں زمین پر چت لیٹ کر ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ساتھ افلاطون پر بحث کرتا اور پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور اپنے پوتوں کے ساتھ کبڈی کھیلنے لگتا۔ لیکن وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی مستقل "جسمانی سرگرمی" رقص ہے۔ ناچنے کے لیے آدمی نہ کبھی کمسن ہوتا ہے نہ مسن۔ رقص ہر عمر میں سیکھا جا سکتا ہے اور رقص کرنے کا موزوں ترین وقت وہی ہے جب آپ کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہو۔ اس لحاظ سے اس کی پرچھائیں ان عظیم اداروں کی حدود سے بھی باہر نکل جاتی ہے جن کی اس نے بنا ڈالی تھی۔ یہ پرچھائیں دنیا بھر کے کھیل کے میدانوں پر تھرکتی رہتی ہے اور مسرور و شاداں بچوں کے لیے یہ سایۂ شفقت ہے ؛



لیونارڈو دا ونچی

عصرِ جدید کا پیش رو

"جو زندگی عمل سے بھرپور ہو وہی طویل زندگی ہے"

جس شخص نے یہ الفاظ لکھے وہ اسی معیار کے مطابق صدیوں زندہ رہا اور اس نے ایک نہیں بلکہ دس زندگیاں گزاریں۔ اس لیے کہ لیونارڈو دا ونچی نہ صرف مصوّری کے عہدِ زرّیں کا تاجدار تھا بلکہ سائنس کا ایک ہمہ گیر عبقری بھی تھا۔

وہ عصرِ جدید کا آدمی تھا۔ ہم میں سے ایک تھا۔ ہمارے تکنیکی ترقیات کے دور میں نہیں بلکہ عصرِ جدید کی صبحِ اوّل کی پیدائش کے وقت، جسے ہم نشاۃِ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ایسی کئی چیزوں کو سمجھا۔ ان کی پیش قیاسی کی اور انہیں ایجاد کیا جنہیں معلوم کرنے کے لیے سائنس کو چار سو برس کا عرصہ درکار ہوا۔

داونچی کے بیشتر انکشافات اس کی یادداشتوں ہی میں مستور اور غیر منکشف رہے۔ حال ہی میں ان یادداشتوں کو جمع کر کے شائع کیا گیا ہے کیوں کہ لیونارڈو کی وفات کے بعد وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئی تھیں اور غالباً ان میں سے نصف تو ہمیشہ کے لیے ضائع ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ نیلام کر دی گئیں جو اُن کی قدر و قیمت کا تعین اس کے مندرجات سے نہیں بلکہ اس شخص کے انوکھے سوادِ تحریر کی وجہ سے انہیں خریدتے تھے اور یہ سوادِ تحریر نہ صرف خطیبوں کا سا تھا بلکہ ان مسوّدات کو پڑھنے کے لیے آپ کو انہیں الٹ کر اس کا عکس آئینے میں دیکھنا ہوگا۔ اس کا مصنّف بائیں ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ گو بعد ازاں وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں روانی کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ قدرت نے جس بچّے کے دامن کو بہت سے خدا داد جوہروں سے مالا مال کیا اس کے لیے والدین کا انتخاب انمل بے جوڑ تھا۔ اس کی ماں کیٹرینا کسانوں کے ایک بے نام گھرانے کی ایک سولہ سالہ لڑکی تھی۔ اس کا باپ پیئرو داونچی سلیم الطبع وکلاء کے طویل شجرے والے خاندان کا فرد اور بزرگ تھا۔ ٹسکن کے موسمِ گرما کی ایک آتشیں صبح کو قدرت نے اس مرد اور اس لڑکی کو اپنے صنّاع کی گرفت میں دے دیا جس نے اپنے اس شاہکار کو سانچے میں ڈھالا جو ۱۵ اپریل ۱۴۵۲ء کو انچیانو کے مقام میں پیدا ہوا۔ پیئٹرز کو نیچ ذات کی کیٹرینا کے ساتھ شادی کرنے سے باز رکھنے کے لیے اس کے گھر والوں نے اس کی شادی ایک اچھے خاندان کی لڑکی سے کر دی۔ ادھر کیٹرینا نے ایک کسان سے بیاہ کر لیا۔ اس دَور کے رسم و رواج کے مطابق

پیئرو دا ونچی نے اپنی محبت کی یادگار، لڑکے کو اس کی ماں سے خرید لیا اور لیونارڈو کو اپنا جائز بیٹا تسلیم کر لیا۔ اوائل عمر میں یہ اپنے باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لیے لاڈ پیار سے بگڑ گیا۔ اس کا حیرت انگیز حسن اور حاضر جوابی عام طور پر اس کی خطاؤں کی معافی کا سبب بنتی ——— اور یہ خطائیں بلاشبہ وہی تھیں جن سے زندگی بھر وہ اپنا دامن نہ چھڑا سکا۔ یعنی معصومانہ ستم ظریفیاں، بے پناہ خود اعتمادی اور ہوائی قلعے بنانا۔ لیکن دا ونچی کے ہوائی قلعے وجدانی ہوتے تھے۔ بعد کی زندگی میں وہ لوگوں کو یہ جتانے کی کوشش کرتا تھا کہ جب ایک فن کار بظاہر کچھ کام کرتا نظر نہ آئے تو اس وقت وہ اپنی تخلیقی بلندیوں پر ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی جب کہ اس کی شہرت بام عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے آجر اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ گھروں کو روغن کرنے والے کی طرح تمام دن برش ہاتھ میں لیے کام کرتا رہے۔

اس لڑکے نے فلورنس کے قریب دا ونچی کے قصبے میں اپنے باپ کی خاندانی جاگیر میں پرورش پائی تھی اور یہ عرصہ اس نے اس قصبے کے خوب صورت و خوش منظر دیہی علاقے میں بیکار پھرتے ہی گزارا یہاں تک کہ سایہ دار چھاتہ نما صنوبر کے جھنڈ اور پیچ و خم کھاتے ہوئے چشمے، سپنوں کی گھاٹیاں اور نازک جنگلی پھول اس کی روح میں اس طرح رچ گئے کہ بعد میں یہ ان جواہرات کے روپ میں جلوہ گر ہوئے جنہیں وہ اپنی منظر کشی کی زینت بناتا تھا جب اس نے اپنے اساتذہ کو اس بجا سوال سے چراغ پا کیا تھا کہ کیا اس کی ریاضی کی کتابوں میں سوالات کے حل کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا تھا؟ موسیقی کا وہ دلدادہ تھا اور بڑے مسحور کن

انداز میں وہ ساز بجایا کرتا تھا۔ نظموں کے بند اس کی نوکِ زبان پر ہوتے تھے۔ جو کچھ بھی اس نے سیکھا اس کا زیادہ تر حصّہ اس نے اپنے آپ ہی سیکھا اس لیے کہ اس کے لیے ساری زندگی اس کی خوب صورت مادرِ فطرت تھی۔

اپنی حقیقی ماں کے بارے میں اسے کبھی کچھ نہیں بتایا گیا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ کہیں موجود ہے اور ماں کو دیکھنے کی حسرت مدتوں اس کے دل میں سلگتی رہی اور ایک دن یہ جذبات امڈ کر اس نذرانۂ عقیدت کے روپ میں ظاہر ہوئے جس سے بڑا نذرانہ حضرت مریم کو کسی نے پیش نہیں کیا۔ وہ جو کبھی ماں کی مامتا یا ننھے بیٹے کی محبّت سے آشنا نہیں ہوا۔ پوری دنیا کو اس نے عزیز ترین متاعوں کی تلاش میں چھان مارا۔ اس نے کھلے ہوئے پھول، بھیڑ کے معصوم بچے، ننھے پرندے اور درختوں اور پہاڑوں کو اس مسرت کی تلاش میں کھنگالا جو وہ ماں کی گود میں بیٹے کی تصویر میں بچّے کے چہرے پر دکھانا چاہتا تھا۔

جب پیٹرو داونچی نے اپنے لڑکے کی ابتدائی ڈرائنگ دیکھی تو اس نے دوسرے مضامین کی تعلیم کا سلسلہ ختم کرا کے اسے ایک شاگرد کے طور پر فلورنس میں ویراشیو کے سٹوڈیو میں داخل کرا دیا۔ ویراشیو کو ان تمام فنون میں دخل تھا۔ جس میں لیونارڈو کو ماہر بننا تھا۔ مصوری، مجسمہ سازی، فنِ تعمیر، موسیقی، مساحت اور مطالعہ فطرت، چنانچہ استاد اور شاگرد دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش تھے سٹوڈیو میں اکثر اور سٹوڈیو کے باہر دوسرے نوجوان آرٹسٹ بھی تھے۔ جو قدرتی طور پر لیونارڈو کے بہترین دوست بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک مصوّر بامیتلی نامی بھی تھا جو اکثر اسکے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ بھلا ان لوگوں کی آپس کی گفتگو سننے کے لیے کون بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے

پر تیار نہ ہو گا؟ جب وہ حقوق کے لیے گرما گرم مباحث میں مصروف ہو جاتے یا آپس میں کوئی وحشیانہ مذاق کرتے یا ایک دوسرے سے کشتی لڑتے یا گھوڑں کو سدھاتے۔ آخری شغل لیونارڈو کا پسندیدہ کھیل تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس قدر طاقت ور تھا کہ ہاتھ سے گھوڑے کی نعل کو دُہرا کر دیا کرتا تھا۔

داونچی کو آپ کبھی کبھار فلورنس کے چوک اور گرجاؤں میں ان کے مصوّری اور نقاشی کے نوادرات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے گھومتا دیکھتے یا پھر وہ پُر ہجوم چوک کے سایہ دار حصّے میں اس وقت کے سرکردہ ریاضی دانوں، علم فلکیات کے ماہرین اور جغرافیہ دانوں کے قدم بہ قدم چلتا دکھائی دیتا تاکہ جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ سب کچھ ان سے سیکھ لے۔ وہ باتیں کرنے کا بڑا شوقین تھا، اور بھرے چوک میں کسی نمایاں جگہ ٹھسّے سے کھڑا ہو کر شیخی بگھارتا اور ڈوں کی لیتا۔ اور مجمع جب پہاڑوں کے نیچے سرنگ بنانے اور عمارتوں کو شہر کی دوسری طرف منتقل کر لینے کی تجاویز سنتا تو اس کی ان باتوں پر کبھی حیرت زدہ ہو جاتا اور کبھی اس کا مذاق اڑایا کرتا۔ یہ تجویزیں جو الہامی معلوم ہوتی تھیں سائنس سے داونچی کے گہرے شغف کا جزو تھیں اور سائنس اس زمانے میں ترقی کے راستے پر خاصی گامزن ہو چکی تھی۔ اس نے ریاضی اور طبیعات، نباتات اور علم تشریح الاعضا میں اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ یہ مطالعہ آرٹ سے ہٹ کر نہ تھا بلکہ گویا اسی کا ایک جزو تھا۔ اس کے نزدیک آرٹ اور سائنس میں کوئی اساسی فرق نہ تھا۔ بلکہ یہ دونوں علم خدا کی بنائی ہوئی کائنات کی تشریح کے طریقے تھے۔ وہ ان مصوّروں پر طنز کیا کرتا تھا جو فطرت کی تخلیق میں اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ انہیں خود اپنی

اصلاح کرنی چاہیے۔ فطرت غلطی پر نہیں ہو سکتی۔

لیکن جب اس نے تصویریں بنانی شروع کیں تو لیونارڈو سرد و عریاں حقائق کو حسن کا دمکتا ہوا جامہ پہنانے لگا۔ اس کا علم، اس کی "تکنیک" اور اس کی بے داغ ڈرائنگ کسی جادوگر کے ہاتھ کی صفائی کی طرح اس میں مضمر تھی اور وہ ایک ایسے شخص کی مانند تصویروں میں رنگ بھرتا تھا جسے زندگی سے والہانہ محبت ہو۔ اسے زندگی سے کتنا پیار تھا! اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے خاکوں کے مجموعے کے ورق الٹنا کافی ہے، اور ان اوراق کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ایک صفحے پر ایک بچے کے گھٹنے کے گڑھے اور شکنوں کا خاکہ ہے تو اسی کے ساتھ مرتے مارتے سپاہیوں کے اینٹھے ہوئے چہرے بھی نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ ننگ دھڑنگ مزدور مشقت کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری جگہ ایک نوجوان عورت کو گھٹنوں کے بل دعا مانگتے دکھایا گیا ہے۔ کہیں وہ ایک بوڑھے گداگر کی گردن کے پٹھوں میں اعصابی تشنج کا خاکہ کھینچتا ہے اور کہیں اس نے ایک کھیلتے کودتے بچے کی مسرت کو نقوش میں مقید کر لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دن دن بھر حسین یا بے ڈھنگے لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا تھا تاکہ ان کا مکمل مشاہدہ و مطالعہ کر سکے۔ وہ بوڑھے آدمیوں کو دم توڑتا دیکھنے کے لیے ہسپتال جایا کرتا اور کسی مجرم کو تختۂ دار پر لٹکتا دیکھ کر اس کے آخری لمحات کے تاثرات کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ اپنے ایک مخصوص لباس سے بڑی آسانی کے ساتھ پہچانا جاتا تھا۔ سنہرے لچھے دار بالوں پر وہ سیہ رنگ کی گول ٹوپی چڑھا لیتا تھا۔ اس کے جسم پر گلابی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا عبا نما لبادہ اس طرح لہراتا جیسے گلیوں میں ہوائی بھگدڑ کے

وقت گل ہوا کا پودا جھوم رہا ہو۔ اس لباس ہیں وہ ماں کی چھاتی پر کسی معصوم بچے کی حریصانہ لپک دیکھنے کے لیے گھومتا پھرتا۔ پھر وہ انسانی جسم کے الوہی تناسب کو صحیح صحیح طور پر نقش کرنے کے لیے چوری چھپے کسی مردہ جسم کی چیر پھاڑ میں مصروف ہو جاتا کیونکہ اس زمانہ میں لوگ اس حرکت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لیونارڈو نے جتنا وقت علم تشریح الاعضاء پر صرف کیا اتنا کسی اور علم پر صرف نہیں کیا۔ اس نے اپنی تصویروں میں یہ ظاہر کیا کہ ہمارے رگ پٹھے ایک طرح کا بیرم ہیں۔ اور آنکھ گویا ایک عدسہ ہے۔ قلب کی اس نے پانی کی طاقت سے چلنے والے ایک پمپ سے مشابہت دی اور نبض کی ضرب اور قلب کی حرکت میں باہمی تعلق و ربط بتایا۔ اس نے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ قلب کے عضلات کے انقباض کی اصلی وجہ وہ ڈورے ہیں جو اس کے سکڑنے اور پھیلنے میں اعتدال پیدا کرتے ہیں۔ ہسپتال میں اپنے متعدد مشاہدات سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ بڑھاپے میں موت کا ایک سبب شریانوں کا اکڑ جانا ہے۔

اسکے باوجود جب وہ تیس سال کا تھا تو لورینزو دی میڈیسی اعظم نے لیونارڈو کا ایک بربط نواز کی حیثیت سے سفورزا سے متعارف کرایا جو مور کہلاتا تھا میلان کے تخت کے پس پردہ سفورزا ہی کی شخصیت کام کر رہی تھی جو ایک سانولا، دغابازانہ، عملی اور وحشی آدمی تھا۔ لیونارڈو کا خط پڑھ کر اس نے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی۔ وہ اس آدمی کو استعمال کر سکتا تھا۔ کیونکہ داونچی نے لکھا تھا کہ وہ ایک ہلکے دستی پل کا موجد ہے جو دشمن کا تعاقب کرتے وقت ندی نالے عبور کرنے میں مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی دعوٰے کیا تھا کہ اس نے ایک پانی کھینچنے والا پمپ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ کسی ایسے

قلعہ کی خندق کا پانی بعجلت نکال پھینکا جا سکتا ہے۔ جس کا محاصرہ مقصود ہو اور کسی محصور قلعہ پر دشمن سیڑھیاں لگا رہا ہو تو انہیں اتار پھینکنے کے لیے وہ ایک بیرم ایجاد کر چکا ہے۔ وہ بڑی بڑی توپیں ڈھالنے کے فن کا ماہر ہونے کا مدعی ہے اور پیادوں کے لیے راستہ صاف کرنے کی ایک خودکار بکتر بند گاڑی بنانے کی اس کے پاس سکیمیں ہیں اس کی یادداشتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فوجی سائنس کی مہارت میں وہ دوسری جنگ عظیم کے لیے تیار تھا۔ وہ ایک ۳۳ دہانوں والی توپ ڈھال سکتا تھا جس میں وقت واحد میں گیارہ دہانوں سے گولے برسائے جاتے تھے۔ وہ مشین گن، تیز فائر کرنے والی بندوقوں، مخروطی گولوں، گرل چھروں اور شارپنل کے ڈیزائن بنا چکا تھا۔ اس نے مقررہ وقت پر چلنے والے فلیتے اور دستی بم بنائے اور گیس سے محفوظ رکھنے والے نقاب کے خاکے تیار کیے۔ اس نے توپ خانے کی اصطلاح میں گولے کی بلندی اور وزن کا تناسب دریافت کیا اور اپنی توپوں کو پوری صحت کے ساتھ اٹھانے اور نیچے کرنے کے لیے ایک پینچا اور شہ پر کا طریقہ وضع کیا۔ اس نے اپنی توپوں کو پہیئے دار گاڑیوں پر نصب کیا اور توڑے دار بندوق کی بجائے جوڑدار بندوق ایجاد کی۔

جب لیونارڈو فلورنس کے چمکتے ہوئے سورج کو چھوڑ کر میلان کے تند موسم کے علاقے میں پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے فرائض میں ڈچز کے غسل خانے میں نلکہ نصب کرنا اس کے تھیٹر کے لیے لباسوں کی تراش خراش اور پردوں پر مناظر کی نقاشی بھی شامل ہے اور اس کے ساتھ مور کی مغرور اور سرد مہر داشتہ کی زیورات اور مخملی گدّوں کے ساتھ تصویر بھی بنانی تھی۔ اس نے اس شہر کے لیے

نہروں کا ایک وسیع نظام تیار کیا اور حسین تر میلان کا ایک ایسا خاکہ مرتب کیا جس میں دو سطح والی شاہراہوں کی تعمیر بھی شامل تھی تاکہ ان پر مختلف سواریاں چل سکیں۔ لیکن اس نقشے پر کبھی عمل نہیں ہوا۔ ناکہ بندی کے ماہر کی حیثیت سے اسے آلپس کی وادیوں کو شمال کی طرف سے حملوں کی مدافعت کے قابل بنانے کے لیے بھیجا گیا اور اسی جگہ انگاڈین کی حسین و دلکش وادی میں اس نے پہلی بار آلپس کی لطیف اور خمار آگیں ہواؤں کا پہلا جرعہ پیا۔ اس نے بلند و خمیدہ چٹانوں کی بنیادوں کا سراغ لگایا اور اس نے بڑی تعظیم کے ساتھ چٹانوں کی دراڑوں میں سے ان انگلیوں سے پھول پتیاں جمع کیں جو بعد میں انہیں کینوس پر حیات جاوداں بخشنے والی تھیں۔ اس تجربے اور عہد طفولیت میں غاروں کے اندر مہم جوئی کے حافظے سے اس کی شاہکار تصویر "چٹانوں کی کنواری" نے جنم لیا۔ جس میں مناظر اور پودے وغیرہ پس منظر میں نہیں دھکیل دیئے گئے ہیں بلکہ ان کی بہار آفریں شبیہوں کے تقدس میں اضافہ کرتی ہے۔ اس شبیہہ میں ایک قابل پرستش ماں، ایک فرشتہ جو اتنا ہی حسین ہے جتنا حسین ہم ایک فرشتہ کو تصور کر سکتے ہیں اور وہ بچہ ہے جو اپنے کھیل کے ساتھی سینٹ جان پر اپنی ننھی انگلیاں برکت دینے کے انداز میں سایہ کیے ہوئے ہے۔

اس تصویر کو بنانے کے لیے میلان کے ایک مذہبی ادارے نے بیس اشرفیوں کی حقیر رقم کا معاوضہ پیش کیا تھا۔ لیکن جب لیونارڈو نے اس تصویر کو مکمل کر لیا تو اس کا یہ خیال تھا کہ اس کا معاوضہ سو اشرفی ملنا چاہیے۔ اس پر راہبوں نے معاہدہ منسوخ کر دیا۔ لیونارڈو تصویر سنبھال کر بیٹھ گیا۔ راہبوں نے

اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ لیونارڈو ان سے بیس برس تک عدالتوں میں لڑتا رہا۔ بالآخر شاہ فرانس نے یہ تصویر خرید لی اور پیرس میں اپنے محل لاؤرے میں اسے ٹانگ دیا۔ لیونارڈو نے پھر اپنے نائبین کی مدد سے ان راہبوں کے لیے جو اب کچھ ٹھنڈے پڑ چکے تھے اس تصویر کی ایک نقل تیار کی اور یہی وہ تصویر ہے جو آج لندن کی نیشنل گیلری میں لٹکی ہوئی ہے۔

جو تصویر ایک زمانے میں غالباً دنیا کی عظیم ترین پینٹنگ تھی۔ اس کے لیے لیونارڈو نے اس منظر کا انتخاب کیا جس کی عکاسی متی نے اپنی انجیل میں ان الفاظ میں کی ہے۔

"جب شام ہوئی تو وہ (یسوع) بارہ حواریوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا اور جب وہ کھا رہے تھے تو اس نے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک مجھ سے دغا کرے گا۔ وہ بہت ہی دل گیر ہوئے اور ہر ایک اُس (یسوع) سے کہنے لگا، اے خداوند! کیا وہ میں ہوں؟ ـــــ اور ان سب کے درمیان خاموش و پُرسکون حالت میں مسیح بیٹھے ہوئے تھے، اُداس اور خاموش۔ اور ان کے عقب میں ایک دریچے سے ہماری چھوٹی سی دنیا درخشاں و تاباں نظر آرہی تھی، جو حُسن و زندگی سے معمور تھی، لیکن جسے انہیں بھی اسی طرح خیرباد کہنا تھا جس طرح ہم سب کو ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔"

اس کی ایک تصویر "آخری عشائیہ" ایک خانقاہ کے کمرہ طعام کی دیوار پر پینٹ کی گئی تھی۔ بدقسمتی سے پلاسٹر رنگوں کے لیے قطعاً موزوں نہ تھا اور اس میں

بہت جلد سیل ظاہر ہونے لگی۔ بیس برس کے اندر یہ تصویر پھپھوندی سے مسخ ہو گئی۔ اور اس سے چھوٹے چھوٹے چھلکے تڑخ کر جھڑنے لگے۔ اس کے بعد اس دیوار میں جس پر یہ نقش بنایا گیا تھا بڑی سنگدلی سے ایک دروازہ تراش دیا گیا۔ جب نپولین کے سپاہی یہاں آئے تو وہ مسیح اور حواریوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا کر محظوظ ہونے لگے بعد ازاں اس تصویر کو اپنی اصلی حالت پر بحال کرنے والے دعویٰ داروں نے نسلاً بعد نسلاً تباہی کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انہوں نے اس پر دارنش کی پرتیں چڑھائیں جو اس تصویر کو کھانے لگیں۔ بعض نے تو ابتدائی خطوط اور خدوخال تک کو بدلنے کی جسارت کی۔ آخری بار غالباً بہترین طریقہ سے اور بڑی نفاست کے ساتھ اسے اپنی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کی گئی جس کی وجہ سے وہ کسی قدر اپنی اصل کے مشابہ ہو گئی۔ لیکن اگر لیونارڈو کے ابتدائی خاکے اور دوسرے آرٹسٹوں کی اس وقت کی بنائی ہوئی نقلیں فراہم نہ ہوتیں۔ جب یہ تصویر تازہ تازہ بنی تھی تو ہم شاید ہی اس کا اندازہ کر سکتے کہ آخری عشائیہ کا تصوّر کتنے پرشوق انداز میں کیا گیا ہوگا اور کس اخلاص سے اس تصوّر کو عملی شکل دی گئی ہو گی۔

لیونارڈو کی نقاشیوں کا ہر ضیاع —— اور اس کی بیشتر تصاویر ضائع ہو چکی ہیں —— المناک ہے کیونکہ اس نے چند ہی تصاویر مکمل کیں۔ گو اس کے بنائے ہوئے خاکے ہزاروں کی تعداد تک جا پہنچتے ہیں، اور اس نے ہر تصویر کے سلسلہ میں بے شمار ابتدائی مشقیں کیں اور جب بالآخر وہ پینٹ کرنا شروع کرتا تو مسلسل کئی کئی دن کھانا تک کھائے بغیر مصروف

رہتا اور وہ بھی اس طرح کہ دن دن بھر اپنی تصویر کے سامنے بیٹھا رہتا اور اس پر زیادہ سے زیادہ تین بار برش چلاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ دوسرے دن وہ سارے کام پر پانی پھیر کر نئے سرے سے کام شروع کرتا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا وہ کسی کام کو پوری صحت کے ساتھ مکمل بھی سمجھتا تھا اور شاید اسی لیے اس نے اپنی کسی تصویر پر دستخط نہیں کیے۔

اس تمام وقت میں جب کہ داونچی ایک دیوتا کی طرح تصویروں میں رنگ و روغن بھرتا تھا۔ وہ سائنس کے ذریعہ دنیا پر فتح پانے کے خواب دیکھنے کی جسارت بھی کرتا تھا۔ جس کی فانی انسانوں میں سے بہت کم جرأت کرتے ہیں۔ آسمان اس کی قیاس آرائیوں پر حد نہیں لگا سکتا تھا نہ اس کے عمیق تجربات سمندر کی گہرائیوں کو خاطر میں لاتے تھے اور وہ تصوّر ہی تصوّر میں آسمان اور سمندر دونوں میں اس یقین کے ساتھ غوطے لگاتا تھا کہ ایک نہ ایک دن انسان کا جسم بھی ان حدود کو توڑے گا۔

ہوا پر فتح پانے کی کوشش سے قبل داونچی نے فضا اور پرندوں کی پرواز کے بارے میں بنیادی امور کا مطالعہ کیا۔ پرندوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس نے یہ سیکھ لیا کہ پرندے ہوا کے مخالف کیوں اڑان کرتے ہیں۔ اس نکتے کو پالیا کہ پرندوں کے بازوؤں میں شگاف کے فوائد کیا ہوتے ہیں اور یہ سمجھ لیا کہ اس سے پرندے کو سیدھا اوپر اٹھنے میں مدد ملتی ہے۔ کاغذی نمونوں پر تجربہ کرنے کے بعد اس نے دم کے چکر اور گرتے پتے کے چکر، ناک کے بل غوطہ لگانے اور قلابازیوں کے خدشات کی پیش قیاسی کر لی۔ چنانچہ وہ ان حالتوں سے محفوظ

نکل آنے کی مفصل ہدایت دیتا ہے۔

پرواز کرنے والی مشین کے بارے میں اس کے ابتدائی خاکے ایک دیوپیکر مکھی یا چمگادڑ کے سے ہیں وہ اس مشین میں پرندوں کی طرح بازوؤں کے پھڑپھڑانے کی توقع رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سِلے ہوئے چمڑے کا ایک جوڑ دار ڈھانچے کا نقشہ بنایا۔ مگر چونکہ مجوّزہ مشین میں انسانی پٹھوں اور عضلات کے سوا، توانائی کا کوئی اور وسیلہ نہ تھا اس لیے اس نے اپنے ہوا باز کے بارے میں یوں تصوّر کیا گویا وہ مشین کے فریم میں اوندھے لیٹ کر اپنے بازوؤں سے ان پیچیدہ پروں کو ہوا میں چپوؤں کی طرح چلائے گا۔

لیونارڈو سب سے پہلا شخص تھا جس نے حرکی مشین کے لیے ایک پراپلر کا خیال پیش کیا۔ اس کے بنائے ہوئے ماڈل میں پراپلر افقی طور پر کام کرتا ہے۔ اور پوری مشین یعنی بجرا اور پراپلر کو سہارنے والی بلّیاں پراپلر کے بازوؤں سے معلّق لٹکی ہوئی ہیں۔ اس طرح گویا داونچی نے ہیلی کاپٹر ایجاد کیا۔ سب سے پہلے اس نے یہ سوچا تھا کہ ہوا باز پائیدان پر پاؤں رکھ کر مشین کو چلائے گا جس سے اس کے سر پر پنکھ گھومتے رہیں گے۔ لیکن اپنے گتّے کے ماڈل میں وہ سخت سپرنگ کے استعمال سے اس کی عملی کارکردگی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جیسے جیسے یہ سپرنگ ڈھیلا پڑ کر کھلتا جاتا تھا پراپلر کے پنکھے تیزی سے گھومتے جاتے تھے اور جس طرح داونچی نے پیش بینی کر لی تھی۔ اس مشین کے لیئے رن وے کی ضرورت تھی اور نہ اڑان کے لیے سازگار ہوا درکار تھی بلکہ یہ مشین سیدھی اوپر اٹھے گی۔ اس کے نظریات معجز نما حد تک معقول ہیں لیکن ہلکے ایندھن کے احتراق

پذیر انجن کی غیر موجودگی میں وہ ان کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرواز کی اس نے کوشش ضرور کی۔ اس بارے میں اس نے اتنی رازداری برتی کہ ابھی تک یہ اشتباہ باقی ہے کہ اس نے کس قسم کا جہاز استعمال کیا۔ غالباً یہ گلائیڈر تھا۔ انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ طیارہ ایک اونچی عمارت پر تیار کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ایک تنہا حوالے سے پتہ چلتا ہے جس کا تذکرہ ہوتا چلا آتا ہے۔ بالآخر یہ طیارہ اڑایا گیا۔ داونچی نے خود اس کو چلایا لیکن یہ پرواز ناکام ہوگئی۔ اور بظاہر داونچی نے دوسری بار کوشش نہیں کی۔ اسے بھی خوبئ قسمت تصور کرنا چاہیے اس لیے کہ اگر وہ اس کی کوشش کرتا تو ممکن تھا اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اور وہ اپنا قیمتی وقت خواہ مخواہ اس مسئلہ کو سلجھانے میں صرف کرتا جو اس زمانے میں حل ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی ناکامی بھی ایک ضمنی فائدے کی حامل تھی کیونکہ اُس نے ہوائی چھتری ایجاد کی جس کا کچھ عرصہ بعد کامیابی سے مظاہرہ کیا گیا۔

لیونارڈو کی ایجادات بے شمار ہیں اس نے زمین میں سوراخ کرنے والا برما، بنے بنائے قابل انتقال مکانات، سلاخیں تیار کرنے والی مشین، پیچ کاٹنے والی مشین، بورنگ مشین، بل ڈوزر، سیمنٹ ملانے والی مشین، سُوت کاتنے والی مشین اور بندرگاہ کی تہ کو کیچڑ وغیرہ سے صاف کرنے والی کشتی ایجاد کی۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے اعداد و شمار ظاہر کرنے کے لیے گراف تیار کیا۔ پہلا شخص تھا جس نے بکتر بند بحری جہازوں اور دخانی قوت کے استعمال کی

تجویز پیش کی۔ اس نے پہلی بار ایک مقناطیسی سوئی کو افقی محور پر نصب کیا۔ اور اسی طرح اس نے ہمیں وہ قطب نما دیا جس سے آج ہم سب آشنا ہیں۔ آج ہم جسے تدریجی گیئر کہتے ہیں اس کا موجد بھی یہی تھا۔ اس نے دندانے دار چکروں کے ذریعے یہ معلوم کیا کہ ایک پہیہ ایک منٹ میں کتنی بار گھومتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ہماری جدید کاروں میں فاصلہ پیما لگا ہوتا ہے، اسی طرح اس نے باد پیما ایجاد کیا۔

سمندر اور اس کی گہرائی واونچی پر جیسے افسوں کر دیتی تھی اس نے ایک فرد کی آبدوز کشتی اور بڑی بڑی آب دوزیں تیار کیں۔ یہ اندازہ لگنے کے بعد کہ ان سے کتنا عظیم نقصان پہنچ سکتا ہے اس نے اپنے تمام خاکے تباہ کر دیئے۔ کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ انسانوں کے دلوں میں اتنی کمینگی موجود ہے۔ کہ ایسے اہم راز ان کے سپرد نہیں کیئے جا سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سمندر کی تہ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں۔

نیوٹن سے بہت آگے لیونارڈو نے کشش ثقل کے اصول کو پیش کیا۔ وہ پہلا سائنس دان تھا جس نے "متحجر" اشیاء اور اس کی اہمیت کو سمجھا۔ اس کے زمانے میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ پہاڑوں کی چٹانوں پر جو سمندری سیپیاں پیوست نظر آتی ہیں وہ یا تو کسی زمانے میں پکنک منانے والوں نے وہاں چھوڑ دی ہوں گی یا پھر طوفان نوح کی موجوں نے انہیں یہاں چٹانوں پر لا پھینکا۔ لیونارڈو نے بجا طور پر یہ اعلان کیا کہ یہ "متحجرات" در اصل ان معدوم جانوروں کے نشانات ہیں جن کا اس زمانے میں وجود تھا جب یہ چٹانیں سمندر کی سطح کی تلچھٹ تھیں۔ زمین کے بارے میں اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ صرف پانچ ہزار سال قدیم نہیں

جیسا کہ انجیل میں بتایا گیا ہے بلکہ بہت ہی قدیم ہے۔ اس نے یہ تیقن علم طبقات الارض میں اپنی اوّلین تحقیق سے حاصل کیا جس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی طرف مائل ہوا کہ دریائے آرنو کو اپنا پاٹ تیار کرنے میں دو لاکھ سال لگے۔

داونچی کی خوش قسمتی سے تطہیر دین والوں کی نظر اس کی یادداشتوں پر نہیں پڑی کیوں کہ داونچی وہی نظریات بیان کر رہا تھا جس کی پاداش میں گیلیلیو کو اذیت سہنی پڑی۔ یعنی یہ کہ زمین سورج کے گرد بیضوی مدار میں گھومتی ہے۔ اس کا محور اس کی گردش کی سطح کی طرف کسی قدر جھکا ہوا ہے۔ سورج حرکت نہیں کرتا جیسا کہ وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے یہ محض ایک سیّارہ ہے جس کی نظامِ شمسی میں وہی حیثیّت ہے جیسی چاند کی زمین کے مقابلے میں۔ ستارے دور و دراز کی دنیائیں ہیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ سورج بھی انہی ستاروں میں سے ایک ہے۔

قوسِ قزح اور صدائے بازگشت جیسے پادر ہوا موضوع پر لیونارڈو نے عملی طور پر سورج کے طیف نما کا مظاہرہ کیا اور روشنی اور آواز کی لہروں کے نظریئے کا اعلان کیا۔ اس نے معلوم کیا کہ روشنی مڑ سکتی ہے اور مرکز گریز قوّت کے نظریے کو پیش کیا۔ اس نے دھماکہ بموں کا تصوّر پیش کیا اور مادے کے جوہری نظریہ کی طرف اشارہ کیا اس نے یہ بھی پیش بینی کر لی تھی کہ یہ نظریہ ہمیں کہاں پہنچائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے۔

"زمین کے نیچے سے وہ چیز نکل آئے گی جو اپنے ہیبت ناک دھماکے سے ان سب لوگوں کو بے ہوش کر دے گی۔ جو اس کے قریب ہوں گے

اور جو لوگ اس کی فضا میں سانس لیں گے وہ ہلاک ہو کر گر پڑیں گے، جیسے وہ آسمان پر ایک نئی قسم کی تباہی کا نظارہ دیکھ رہے تھے اور آسمان سے شعلے اترتے نظر آئیں گے۔ سورج کی شعاعیں زمین پر آگ لگا دیں گی جس سے آسمان تلے کی ہر شے سلگ اٹھے گی۔ لوگ خود اپنی تخلیق اور محنت کو تباہی سے ہمکنار ہوتا ہوا دیکھ کر مسرت محسوس کریں گے۔

وہ آنکھیں جو مستقبل کے بارے میں اتنا سب کچھ دیکھ سکتی ہوں عجب نہیں جو تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھیں اس نے ۱۵۱۰ء میں خود اپنے ہاتھ سے اپنی جو تصویر چاک سے بنائی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لیونارڈو اٹھاون سال کی عمر ہی میں بہت بوڑھا ہو چکا تھا جس کے چہرے سے علم کے تقدس اور عمر کی بزرگی کے ساتھ ساتھ تھکاوٹ اور کسی قدر مایوسی ٹپکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بیک وقت جو کئی زندگیاں گزارنے کی کوشش کی تھی اس نے اس کا جسم جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

اس پر طرہ یہ کہ جب میلان پر فرانسیسیوں کا حملہ ہوا اور سفورزا وہاں سے بھگا دیئے گئے تو اسے بھی راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ وہ بھاگ کر مانتوا پہنچا۔ وینیس میں آوارہ گردی کی۔ روم میں تکلیف سے دن کاٹے۔ پرما کی سیر کی، فلورنس پہنچا اور جب میلان واپس جانے میں کوئی خطرہ نہ رہا تو گھومتا گھامتا دوبارہ وہیں پہنچ گیا۔ میلان میں آخری اکس سال اس نے بڑی عسرت میں گزارے کیونکہ مور اسے تنخواہ نہیں دے رہے تھے۔ اور اب تو وہ اور بھی مفلس ہو چکا تھا اور جو کچھ اندوختہ پاس تھا اسی پہ گزارہ کرتا تھا۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے

لیے اسے عجیب و غریب کام انجام دینے پڑتے تھے۔ وہ کبھی انجینیر کی حیثیت سے کام کرتا تو کبھی فری لانس آرٹسٹ کی حیثیت سے روزی کماتا۔ اسی سلسلہ میں اس نے فلورنس کے میر گیوکونڈا کی بیوی لیزا اغرار دینی کی تصویر بنائی جس سے ہم آج مونالیزا یا لاگیوکونڈا کے نام سے آشنا ہیں۔ گو مونالیزا مال دار اور فیشن ایبل خاتون تھی تاہم اس تصویر میں وہ سیہ کپڑوں میں ملبوس ہے اور اس کی انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی نہیں۔ وہ اپنے ایک بچے کے غم میں ماتم کناں ہے جس کی موت کچھ ہی دن پہلے واقع ہوئی تھی۔ وہ اکیس سال کی تھی جب وہ اپنی شبیہہ کے لیے مصوّر کے سامنے بیٹھنے لگی۔ لیکن جب لیونارڈو نے اسے مکمل کیا تو چھ سال گزر چکے تھے۔ اس کے باوجود اس نے نہ اس کے ماتمی لباس میں کوئی ردّو بدل کیا نہ پس منظر کی سحر انگیز افسردگی اور اداسی میں کوئی فرق آنے دیا۔ یہ شبیہہ جو ایک حقیقی عورت کا مرقع تو کم ہے البتہ داونچی کے ان خیالی پیکروں میں سے ایک کا روپ دھارے ہوئے ہے جن کے خواب وہ دن میں بھی دیکھا کرتا تھا۔

مونالیزا آپ کے دائیں شانے کے پیچھے کسی چیز پہ مسکراتی نظر آتی ہے۔ اِدھر اُدھر گھومنے سے کوئی فائدہ نہیں چاہے آپ کتنی ہی تیزی سے گھومیں آپ اس شئے کو تو نہیں دیکھ سکتے۔ بس مونالیزا کی مسکراہٹ کی چیستاں میں اس کی جھلک نظر آئے گی اور پھر یہ بھی ایک معمّا ہی ہے کہ یہ مرقّع اس کی مالکہ کو نہیں دیا گیا۔ جب نوجوان بادشاہ فرانسس اوّل نے اسے فرانس میں آکر مقیم ہونے کی دعوت دی تو داونچی اسے اپنے ساتھ ایک انتہائی قیمتی اثاثہ کے طور پر لے گیا۔ بالآخر فرانسس نے یہ تصویر بارہ ہزار فرینکس میں خرید کر

لاؤرے میں آویزاں کردی، وہاں یہ تصویر ۲۱ اگست ۱۹۱۱ء کی صبح آٹھ بجے تک رہی۔ اس کی چوری کی خبر سے یہ افواہیں گرم ہوگئیں کہ کوئی شخص اس کی سحر انگیز مسکراہٹ کے زیر اثر پاگل ہوکر اس عورت کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ جو عرصہ ہوا مر چکی، لیکن جب دو سال بعد یہ چور مونالیزا کی تصویر بغل میں دبائے اطالیہ کے ایک تصویر فروش کی دوکان میں داخل ہوا تو وہ فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک محب الوطن اطالوی کی حیثیت سے پیش کیا اور کہا کہ اس نے یہ تصویر اس کے آبائی وطن لوٹانے کے لیے چرائی تھی۔

داونچی کے آخری ایام وسطی فرانس میں امبوئی کے قریب آرام سے گزرے اس کے ملاقاتی اس کے مفلوج ہاتھوں پر توجہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ وہ اس کے دماغ کو ہمیشہ کی طرح درخشاں پاتے۔ اس وقت بھی وہ ایک ایسی نہر بنانے کے منصوبے پر غور و فکر میں مصروف تھا جس میں مہیب دروازوں کی تعمیر اور وہ تمام لاتعداد تجاویز شامل تھیں جو اس سے بہت پہلے اس کی نوٹ بک میں درج تھیں۔ اس سے قبل اس کی گفتگو کبھی اتنی متنوع، اس کا وجود اتنا پُرکشش اور اس کی مسکراہٹ اتنی دلآویز نہیں تھی۔

اور جب موت ۲ مئی ۱۵۱۹ء کو لیونارڈو سے ملاقات کرنے آئی تو خود اس کے لبوں پر بھی شاید وہی مسکراہٹ تھی —— حکمت و اسرار کے لبوں کا وہ نور جسے تنہا داونچی احاطہ میں لا سکا!



فیبرے

کیڑوں کا ہومر

"قانون کے نام پر مَیں تمہیں گرفتار کرتا ہوں"

وہ شخص جو ریت پر اوندھے لیٹا دنیا ومافیہا سے بے خبر کسی آوارہ گرد کی طرح سوتا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے گردن اٹھائی گاؤں کے کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور بڑے انکسار سے اپنی گرفتاری کی وجہ دریافت کی۔

"مَیں تمہیں دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ تم بڑے ہی مشتبہ چال چلن کے آدمی دکھائی دیتے ہو۔ مَیں تمہیں اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیتا ہوں" سپاہی نے کہا۔

یہ معمّر شخص ایک ٹڈے کی طرح اچک کر اٹھ بیٹھا۔ اُس کی بڑی سیاہ ٹوپی کے چھجّے تلے اس کی پروانے کی سی پلکوں نے چمکدار اور سیہ آنکھوں کو نصف کے قریب ڈھانک رکھا تھا۔ اس نے ایک ایسے استاد کی طرح جو طفلانہ ذہانت کے مسائل سے خوب واقف ہوتا ہے، اس کانسٹیبل کو

سمجھانا شروع کیا کہ وہ کیڑوں مکوڑوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ "مکھیاں؟" اس پولیس کے سپاہی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہو کر محض مکھیوں کو دیکھنے کی خاطر تم اس چلچلاتی دھوپ میں کباب ہوئے جا رہے ہو۔"

یہ سن کر دوسرے شخص نے اپنے شانے اچکائے۔ معاً اس کے بوسیدہ کوٹ کے کاج پر روشنی پڑی تو کوئی رنگین چیز دمک اٹھی اور سرخ ربن کا ایک بل نظر آنے لگا۔ خون کی طرح سرخ، یہ لیجین آف آنر تھا اور ایک گنوار کانسٹیبل میں بھی اتنی سوجھ بوجھ تھی کہ وہ اسے دیکھ کر لوٹ جائے اور یہ بوڑھا شخص دوبارہ ریت پر اوندھا ہو گیا۔ یہ شخص گجردم سے یہیں تھا۔ جب کہ کسان عورتوں کی پہلی کھیپ کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے ادھر سے گذری تھی اور پھر غروب آفتاب کے وقت جب وہ واپس آئیں تب بھی وہ وہیں تھا۔ یہ دیکھ کر ایک عورت نے دوسری سے کہا۔ "پاگل معلوم ہوتا ہے بے چارہ" اور دوسری عورتیں کنپٹی ٹھونکتی ہوئی سر کو جنبش دینے لگیں۔

جین ژاں ہنری کا سیمیر فیبرے ایسے توہین آمیز برتاؤ کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی حساس طبیعت کو ظاہری بے اعتنائی کے پردے کے پیچھے کچھ اس طرح چھپا لیتا تھا۔ جیسے کسی بھنورے کے نازک پروں پر ایک موٹا سا چھلکا چڑھا رہتا ہے۔ بچپن ہی سے وہ غلط فہمیوں کا ہدف بنا رہا تھا۔ فیبرے جنوب وسطی فرانس کے ایک گاؤں میں ۱۸۲۳ء میں ایک ایسی ماں کے گھر پیدا ہوا جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ مزید برآں وہ اپنے اس سب سے بڑے لڑکے کے کھیتوں اور میدانوں سے شغف کو اس کے مجہول پن اور کاہلی پر محمول کرتی کیونکہ

اسے دھات کے ٹکڑے، پرندوں کے گھونسلے اور کیڑے جمع کرنے کا شوق تھا۔ ماں کے نزدیک وہ اس کی حماقت کی نشانی تھی۔ ہنری کا باپ ایک کسان تھا لیکن ایک غیر مطمئن اور ناکام کسان، اس کے خاندان کے لوگوں کی زندگی دیہات کی گندہ بستیوں میں اس طرح بسر ہوتی تھی کہ مفلسی کے باعث یہ ہمیشہ مقروض اور متردد رہتے تھے۔

وہ چار برس کا تھا تو اس کے ماں باپ نے ہنری کو گاؤں میں اس کے دادی دادا کے ہاں اس خیال سے بھیج دیا کہ ایک فرد کے کھانے کے اخراجات تو بچیں گے۔ یہ لوگ بڑے سیدھے سادے، جفاکش اور سادہ لوح تھے، انہوں نے ہنری کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسی دیہی فضا میں اس کے کانوں نے مینڈک کے گیت اور جھینگروں کی شہنائی سنی۔ اس کی آنکھوں نے شہد کی مکھیوں کی سنہری پرواز کا مشاہدہ کیا۔ اور اس کے ہاتھ پھدکتے ہوئے ٹڈوں کو پکڑنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ یہ چھ برس دراصل اس انوکھی زندگی کی بنیاد ثابت ہوئے جو مزید اسّی سال تک جاری رہی اور جس کے دوران اس پر ایسے اعزازات نچھاور کیے گئے جو سائنس اور ادب، بادشاہ اور حکومتیں عطا کر سکتی تھیں۔

دس برس کی عمر میں یہ بچّہ سکول کی چار دیواری میں مقیّد کر دیا گیا جہاں اس کے غبی ہم جماعتوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے میں پانچ سال لگتے تھے لیکن ہنری کے یہاں آنے کے بعد صرف پانچ منٹ میں یہ معلوم کر لیا گیا کہ وہ اوروں سے مختلف تھا۔ اس فرق کی پاداشں میں اسے بے حد ہنسی اور دل لگی کا نشانہ بننا پڑا اور بعض اوقات ٹھوکریں بھی کھانی پڑیں۔ اس کا باپ جو کاشت کار کی

حیثیت سے ناکام ہو چکا تھا۔ ایک شہر کے گندے گلی کوچوں سے نکل کر دوسرے شہر کے گندے گلی کوچوں میں مارا مارا پھرنے لگا جہاں وہ میلے کچیلے کھانے پینے کی دکانیں چلاتا تھا۔ ہنری کے لیے زندگی گندگی اور لڑائی جھگڑوں کا دوزخ بن گئی۔ سترہ برس کی عمر میں جب اس کی مزید تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا تو وہ جنوبی فرانس کی سفید سڑکوں پر فاقہ مستی اور قلاّشی کے باوجود خوشی سے گھومنے لگا کہ وہ کم سے کم اب آزاد تو ہے وہ ایک غیر ہنرمند تارکِ وطن محنت کش کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کبھی کھیت پر تو کبھی ریلوے لائن پر۔ ایک مرتبہ اس نے نظموں کی ایک کتاب خریدی جس کے بعد اس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں بچا تو وہ بھوکے پیٹ تسکینِ روح کی خاطر گیتوں کو الاپتا ہوا چل پڑا۔

ایوانان میں ایک نارمل سکول میں وظیفہ حاصل کرنے کے لیے وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور اوّل آیا لیکن اس کے مدرس اسے کاہل الوجود سمجھتے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اکتا دینے والی رٹائی کی آڑ میں وہ ایک ایسی کتاب سے لاطینی اور اس کے ساتھ ہی یونانی زبان سیکھ رہا تھا جس کا ترجمہ لاطینی زبان میں موجود تھا۔ انیس سال کی عمر میں گریجویٹ ہونے کے بعد وہ کارپینٹراس کالج میں استاد ہو گیا۔ اس کے شاگرد ہر قسم اور ہر عمر کے تھے۔ ذہین نوخیز دل سے لے کر ایسے کمزور دغبی جوانوں تک جو اس کے ہم عمر تھے، یہ سب کے سب گندے اور غیر مہذب تھے۔ اور اپنے اسباق اور اساتذہ دونوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں فیبرے کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ایک تختہ سیاہ، ایک چاک کا ٹکڑا اور اپنی زبان کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اور انہی سے اس

نے انہیں مسحور کیے رکھا۔ کالج کے اُکتا دینے والے نصاب میں کیمیا اور طبیعات کو بھی خود ہی شامل کر لیتا تھا حالانکہ اس نے کبھی یہ مضامین نہیں پڑھے تھے۔ لیکن مستعار کتابوں اور خود ساختہ آلات کی مدد سے وہ جماعت سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہتا اور جیسے جیسے ہر سبق کے عقدے اس پر وا ہوتے گئے۔ وہ اپنے خوشش و خروش کو اپنے طلباء میں منتقل کرتا رہا۔

کپڑوں پر اس نے ایک کتاب خریدی تو اسے ایک ماہ کی تنخواہ اس کی نذر کرنا پڑی۔ اس لیے اس نے ایک طالب علم کو الجبرا سکھانے کی ٹیوشن کر لی حالانکہ خود وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ا سے ب کو کس طرح ضرب دی جاتی ہے اس نے محض اپنے عزم و ثبات کی بدولت دو دن کے اندر اس مضمون پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کی خود آموختہ جیومیٹری نے اسے اور زیادہ افسوں زدہ کر دیا۔ اور اسے علم ہندسہ کی قطعیت میں شاعری نظر آنے لگی۔ وہ اعداد کے بھی سحر میں آ گیا تھا۔ "وہ اعداد جو ناقابلِ مزاحمت اور لافانی ہیں جو کائنات کے ایوانوں کے ستون اور زمان و مکان کے حاکم ہیں"۔ سائنس کے لیے قدرت نے اسے وہ وجدان عطا کیا جو انتہائی عظمت کا حامل تھا۔

لیکن یہ نوجوان قصباتی استاد ملازمت کے فرائض میں بڑی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اکیس سال کی عمر میں شادی کی اور اپنی قلیل تنخواہ کے باوجود ایک بچے کا باپ بننے کی جسارت کی۔۔ بچہ مر گیا اور تنخواہ ہمیشہ دیر سے ہی ملتی رہی۔ اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے فیبرے نے طبیعات اور کیمیا کی تیاری شروع کر دی اور ان مضامین میں یونیورسٹی آف مونٹ پیلئر سے سند

حاصل کیں۔ لیکن پڑھائی کے مناصب اوسط درجے کی قابلیت والوں کے حصے میں آتے تھے فیبرے دوبارہ کارپنٹراس کے سکول میں چاک پھانکنے چلا آیا۔ اور پڑھائی سے جو وقت بھی بچتا اس میں وہ کھیتوں اور میدانوں میں جاکر گورکن کیڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا یا جھینگروں کا شیون سنا کرتا۔ اس کے ساتھی اس کے اسباق کی مقبولیت سے جل کر اسے "مکھی" پکارنے لگے لیکن اس کے شاگرد جو دوسرے مدرسین پر کہیں زیادہ بگڑے ناموں کی پھبتی کسا کرتے تھے فیبرے کی پرستش کرنے لگے۔

آخر کار اسے ایک سفر کی مہم درپیش آئی ——— جو اس کی طویل زندگی کی واحد مہم تھی۔ اسے کارسیکا کے ایک کالج میں تین سو ساٹھ ڈالر سالانہ مشاہرہ پر طبیعات کی تدریس کا کام سونپا گیا۔ کارسیکا کے جزیرہ میں پھول تھے اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ اس کے سمندروں میں سیپیوں کی بہتات بھی فیبرے کے لیے یہ سب کچھ جنت سے کم نہ تھا۔ یہاں اس کی ملاقات اس مشہور نباتات داں سے ہوئی جس نے اسے اطراف وجوانب میں کھلے ہوئے رنگین پھولوں اور شگوفوں کو شناخت کرنا سکھایا۔ اس کی ملاقات ایک سرکردہ ماہر حیوانات سے بھی ہوئی جس نے اسے یہ بتایا کہ گھونگھے کی کس طرح چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ یہ رہنمائی اسے ان دونوں علوم کے مطالعہ کا ذوق اور شغف پیدا کرنے کے لیے کافی تھی اور وہ ہمہ وقت ان کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ بالآخر جب ملیریا نے اسے کارسیکا سے بھگایا۔ تو اس نے یونیورسٹی آف ٹاؤلوس میں حیاتیات کے ڈپلوما کے لیے امتحان دیا۔ اس کے پروفیسر اس کے علم اور اس سے زیادہ اس کی بصیرت پر حیران و ششدر رہ گئے لیکن سب سے اچھی اسامی جو اسے پیش کی گئی وہ ایوانان میں

لڑکوں کے ایک ہائی سکول میں تھی جس کا مشاہرہ تین سو بیس ڈالر سالانہ تھا۔ بیس سال بعد جب یہ ملازمت اس سے چھوٹی تب بھی اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی۔

اس دوران میں اس کے ہاتھ وہ کتاب لگی جس نے اس کے قول کے مطابق اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ جلد علم حشرات الارض کے بارے میں ایک ایسے مصنف کے قلم سے تھی جسے اب تو فراموش کر دیا گیا لیکن جو اس وقت اس موضوع پر سند سمجھا جاتا تھا اس کتاب کی اہمیت اس میں بیان کردہ حقائق کی بجائے ایک غلط بیانی پر مبنی تھی۔ جس نے فیبرے کو حقیقت کا کھوج لگانے کی ترغیب دی۔ اس ممتاز مصنف نے لکھا تھا کہ شکاری بھڑیں بھونروں پر حملہ کر کے انہیں مار ڈالتی ہیں اور اس طرح اپنے لاروا کے لیے خوراک فراہم کرتی ہیں۔ فیبرے اس بھڑکیلی اعصابی شکاری بھڑ سے خوب واقف تھا جس کی ڈنک تلوار کی سی تیز اور نوکیلی ہوتی ہے۔ اس بھڑ کے قریبی مشاہدے سے اس نے یہ معلوم کیا کہ یہ بھنورے کو ہلاک نہیں کرتی بلکہ اس کے اعصابی مراکز پر فنکارانہ جراحی کے ساتھ ڈنک مارتی ہے اور مفلوج لیکن زندہ حالت میں اسے اپنے چھتے میں لے جاتی ہے۔ جہاں یہ انڈے سے نکلے ہوئے بچوں کی نشوونما کے لیے تازہ خوراک کا کام دیتے ہیں۔

یہ انکشاف بظاہر بہت چھوٹا اور غیر اہم تھا۔ لیکن اس سے فیبرے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سائنس میں جن چیزوں کو مسلمات کی حیثیت حاصل ہے ان پر بھی شبہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ اس میں شک نہیں اس کی زندگی کے اطراف ناساز گار حالات نے بے دردی کا حصار

باندھ دیا تھا۔ تاہم اس کے سامنے تحقیق و جستجو کا ایک لامحدود میدان تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ زندگی کی ان اقلیمات میں جہاں ذہانت بہت پست ہے جبلّت ایک وسیع حکمتِ بے شعور کے ذریعہ کام کرتی ہے۔ فیبرے کی دقیقہ رس اور باریک بیں ذہانت نے اس انکشاف پر فوری ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے حشرات میں جبلّت کے پیچیدہ اور دقیق خطوط کا پتہ لگانے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی اور وہ اپنے زمانے کے اس رجحان کو قطعی خاطر میں نہیں لایا جس کی رُو سے زندگی ایک بے روح مشینی نظام سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت کے ایک بڑے فرانسیسی ماہرِ حیاتیات نے جبلّت کی تشریح کرتے ہوئے اسے نابود قرار دے دیا تھا۔ لیکن ایک قصباتی سکول کے غیر معروف استاد کو یہ آگہی ہونے لگی تھی کہ کیڑوں مکوڑوں کی عظیم دنیا میں جبلّت ہی سب کچھ ہے۔ جبلّت جانوروں میں جنم پاتی ہے اور مکمّل طور پر جنم لیتی ہے۔ محض مشق سے اس کی کچھ زیادہ اصلاح نہیں ہوتی نہ تجربہ سے جبلّت کچھ زیادہ سیکھتی ہے۔ اپنے دائرہ عمل میں تو یہ تمام امور سے واقف ہوتی ہے لیکن اس دائرہ سے باہر کچھ نہیں جانتی۔

درس و تدریس کی مشقت و ریاضت سے جو بھی وقت بچتا فیبرے انہی پیچیدہ اسرار کو حل کرنے پر صرف کرتا تھا۔ گرما کے خشک شدہ چشموں اور تالابوں کی تہ میں اور جنگلوں کے بعض قطعات میں جو بعد ازاں اس کے کام کے باعث شہرت پا گئے۔ فیبرے نے عجیب و غریب ننھی مخلوق کی زندگی کے اسرار کو بے نقاب کیا۔ اس نے تیلیا بھونرے کے دورِ زندگی کا انکشاف کیا۔ جس

کے لاروے پھولوں میں چھپے رہتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں جب رس چوسنے آتی ہیں تو یہ چپکے سے ان پر سوار ہو جاتے ہیں اور اس طرح اپنے شکار کی وساطت سے ٹھیک ان گھروں میں جا پہنچتے ہیں جن میں آگے چل کر نقب لگاتے ہیں۔ اس نے ان بھونروں کا مشاہدہ بھی شروع کیا جو مصریوں کے نزدیک بڑے مقدس تصور کیے جاتے تھے ——— اور چالیس برس تک کے مشاہدے تک بھی اس نے اپنے نتائج کو قابل اشاعت نہ سمجھا۔

جب اس کے سائنسی مقالات پہلی بار شائع ہوئے تو پیرس اور دُور و دراز کے ماہرین علم حشرات الارض اپنی آنکھیں ملنے لگے۔ اس وقت تک ان کا علم محض حشرات کی نئی انواع دریافت کرنے کی کوشش تک محدود تھا اور اکثر صورتوں میں نام دینے والے صرف اسی صورت میں کسی کیڑے کو معروف قرار دیتے تھے جب اسے سائنٹیفک نام دیا جا سکتا تھا۔ یہ فیبرے ہی تھا۔ جس نے ان کیڑوں کی زندگی کے غیر معمولی ڈراموں کا انکشاف کیا اور جانوروں کے مردہ ڈھانچوں کو سٹینڈ پہ آویزاں کرنے کی بجائے وہ زندہ جانوروں کو پنجروں میں رکھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگا اور میدانوں اور جنگلوں میں جا کر ان کا مشاہدہ کرتا رہا۔ انگلستان میں چارلس ڈارون نے اس کے مقالات کو حیرت و مسرت سے پڑھا اور شہد کی مکھیوں کی گھر سے وابستگی کی جبلت کے تجربات میں اس فرانسیسی کے تعاون کا طلب گار ہوا جسے اس نے بعد میں "بے نظیر شاہد" کے نام سے یاد کیا۔

ایک دن اس معمولی مدرسہ کے استاد کے پاس فضیلت مآب وزیر اعظم تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر ڈیورانی، فرانس کے سرکاری مدارس کے نظام

میں انقلاب برپا کر رہے تھے۔ انہوں نے ان مذہبی جنونیوں کو نکال دیا تھا جنہوں نے ان مدارس کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے لڑکیوں پر فوقانی تعلیم کے دروازے کھول دیئے تھے۔ فیبرے کی شخصیت میں انہیں اپنا دل پسند مدرس مل گیا تھا۔ ڈیورائی نے اسے پیرس طلب کیا اور جب لیجین آف آنر کا سُرخ فیتہ عطا کیا تو فیبرے کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ فیبرے کو شہنشاہ نپولین سوم کے حضور بھی پیش کیا گیا۔ اور اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ شاید وہ شہنشاہ کے بچوں کا اتالیق بنا دیا جاتا لیکن فیبرے خوشامد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دارالحکومت کے شور و شغب اور بھیڑ بھاڑ سے بھاگ نکلا اور اس نے نیچرل ہسٹری کے عجائب گھر تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ جھینگروں کا شیون اور سرکنڈوں اور بانس پات کے جھنڈوں میں شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ اسے واپس بلا رہی تھی۔

ادھر نپولین سوم اور اس کے وزیر تعلیم کا دورِ حکومت چند دنوں کا مہمان تھا۔ مشتعل اربابِ کلیسا نے ڈیورائی کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور فیبرے کو بھی وزیر تعلیم کا منظور نظر سمجھ کر ہدفِ انتقام بنایا گیا۔ اور اس پر الزام لگا کر کہ حیاتیات کی جماعت میں لڑکیوں کو داخل کر کے وہ ان کی معصومیت کو تباہ کر رہا تھا، برسرِ اقتدار جنونی پارٹی نے کھڑے کھڑے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جب وہ گھر لوٹا تو اس کی پارسا بوڑھی مالکہ مکان نے بے دخلی کے نوٹس کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

اس واقعہ سے کچھ مہینے قبل چہل قدمی کے دوران میں فیبرے کی ملاقات ایک تنہائی کے مارے انگریز سے ہوئی جو اپنی بیوی کی موت پر دل شکستہ و مغموم

تھا۔ یہ مشہور فلسفی جان سٹوارٹ مل تھا۔ جسے فیبرے کی مانند نباتات سے شغف تھا۔ فیبرے نے اپنی خستہ حالی کی صورت میں اس سے رجوع کیا اور مل نے فوری طور پہ دو سو ڈالر کے قرضے سے اس کی امداد کی۔ اس رقم سے فیبرے نے اپنی بیوی، پانچ بچوں اور بوڑھے باپ کو آرنج کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل کیا۔ اور پھر اپنے مستقبل کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے مطالعہ کے کمرے کی دیواروں کی طرح بالکل کورا اور خالی تھا اس وقت اس کی عمر ۴۸ برس تھی اور تدریس کے پیشہ میں اس کا نام داغدار ہو چکا تھا۔ کیڑے مکوڑوں کے متعلق عجیب و غریب معلومات کے سوا اس کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا۔

اس مرحلے پر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اور کچھ نہیں تو اب اس علم ہی کی اشاعت کرے گا اور بتائے گا کہ مادہ نور مکھی میلوں وسیع خوابیدہ کھیتوں اور میدانوں میں کس طرح اپنے شبانہ عاشقوں کو اپنی موجودگی کا اشارہ دیتی ہے کرمک شب تاب ایک بڑے گھونگھے کو بے ہوشی پیدا کرنے والے خفیہ ٹیکہ کے ذریعہ کس طرح ہلاک کر سکتی ہے۔ وہ سیہ بچھو جیسے کریہہ المنظر اور نفرت انگیز مخلوق کی بابت لکھے گا جو جنسی اختلاط کے سلسلہ میں انوکھا رقص کرتے ہیں وہ غلام بناتے والی چونٹیوں کے اپنے سیہ غلام چیونٹوں پر حملے کی داستان تفصیل سے سنائے گا۔ جن صفحات پر اس نے اس پست مخلوق کی زندگیوں کے پر پیچ اسرار بیان کیے ہیں وہ سائنسی تصانیف میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صفحات ہلکے مزاح کی چاشنی سے شگفتہ ہیں جس مخلوق کی مختصر لیکن تاباں زندگی کی روئداد وہ سناتا ہے۔ قاری اس کو پہلے تو سراہتا ہے اور پھر ان سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ صفحات پر دوانس

کے جنگلوں کھیتوں اور پھولوں کے سینکڑوں تذکروں سے مزین ہیں۔ اور ان کے ذریعہ ہم فیبرے کے مختصر سے خاندان کے دلوں تک اس طرح راہ پاتے ہیں کہ اس کے بچوں کی کلکاریاں تک ہمیں سنائی دیتی ہیں۔ جو اس کے مددگار تھے۔

لیکن یہ کتابیں جو ملگجے کاغذ پر چھوٹے حروف میں کسی خاکے یا تصویر کے بغیر شائع کی گئی تھیں ان کی فروخت کی رفتار بے حد سست تھی برسوں تک اسے ان سے بمشکل اتنی آمدنی ہوئی جتنی آمدنی اسے پڑھانے سے ہوا کرتی تھی اور یہ آمدنی بھی بڑی بے قاعدہ تھی۔ ادبی نقادوں نے کم و بیش اسے نظر انداز کیا۔ بہت سے سائنسدانوں نے ان تصانیف کی شگفتگی اور سحر انگیزی ہی پر ناک بھوں چڑھائے۔ فیبرے نے اس پر زندہ دلی کے ساتھ تبصرہ کیا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ جو صفحہ کسی دقت کے بغیر پڑھا جائے کہیں وہ صداقت سے معمور نہ ہو۔ پھر ننھی مخلوق سے یوں خطاب کیا۔ "آجاؤ! سب کے سب ایک ساتھ آؤ۔ اے نیش زنو! بکتر بند پردارو، آؤ اور میری صفائی کی خود شہادت دو۔ ذرا یہ حال سناؤ کہ میرے تمہارے تعلقات کتنے بے تکلفانہ ہیں اور میں کیسے صبر کے ساتھ تمہارا مشاہدہ کرتا ہوں اور کس احتیاط سے تمہاری نقل و حرکت کا حال تحریر کرتا ہوں، اور پھر میرے عزیز کیڑو! اگر تم ان بندوں کو قائل نہ کر سکو تو میں ان سے کہوں گا، تم جانوروں کی چیر پھاڑ کرتے ہو اور میں زندہ رکھ کر ہی ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تم اسے ہولناک اور قابل رحم بنا کر پیش کرتے ہو۔ اس کے برخلاف میں اسے ایک محبت کی جانے والی مخلوق کا درجہ دیتا ہوں۔ تم موت کی تلاش میں رہتے ہو۔ میں زندگی کا سراغ لگاتا ہوں۔"

فیبرے کی تحریروں میں ایک گہری مذہبی تقدیس کی جھلک ہے

جسے وہ کبھی براہ راست ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن جو کبھی اس کے لہجے میں مفقود نہیں ہوتی اور جس میں قدرت کے نظم و باقاعدگی پر اعتقاد و یقین کا پرتو نظر آتا ہے۔ اپنے تمام مشاہدات میں الوہیت کے اس احساس نے اسے ان حشرات سے محبت پر مائل کر دیا جو مقابلتاً کم جری اور کم پاکیزہ دماغوں پہ ناگوار گزرتے ہیں۔ یہی کیڑے دراصل اس کا ساز و سامان تھے۔ اس نے ایک مرتبہ بلدیہ کا توپ خانہ مستعار لے کر یہ دیکھنے کے لیے توپ داغی کہ کیا جھینگر سیٹی بجانا بند کر دیتے ہیں لیکن جب ان کا شور کم نہ ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شور مچانے والے موسیقار خود بہرے ہوتے ہیں۔ مور پنکھی کے پنجرے میں اس کے جسم سے نکلنے والی کسی بُو پر غالب آنے کے خیال سے نفتھلین رکھی لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ نفتھلین کی تیز بُو سے انسانوں کا دم گھٹنے لگا تھا۔ مادہ کی بُو اتنی طاقت ور تھی کہ اس کے پنجرے پر نروں کی بھیڑ لگ گئی۔ اس نے جلوس کی شکل میں نکلنے والے کملی کیڑوں کو ایک پیالے کے کناروں پر بے بسی سے مسلسل اور پے در پے چکر کاٹنے پر مجبور کیا۔ اور پتہ چلایا کہ جلوس کا اصلی سبب ایک مہین ریشمی تار ہے جسے ہر کیڑا گرفت میں لیتا ہے اور پھر اپنا تیار کیا ہوا ایک تار اس سے ملا دیتا ہے۔ وہ صدہا ننھے حشرات الارض کا پل بہ پل، دن بدن اور سال بہ سال مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہا اور اپنے مشاہدات و نتائج کو علم حشرات الارض کے بارے میں ایسے انکشافات کی صورت دیتا گیا جن کی اس سے قبل کوئی نظیر نہیں ملتی اور جو اس سے پہلے ایسی تاب ناک شاعری میں کبھی بیان نہیں کی گئیں۔ اس کے باوجود وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا اور اپنے دبلے پتلے بچوں اور محبوب بیمار بیوی کے اخراجات مشکل سے برداشت کر سکتا تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں اس نے اپنا ایک ذاتی قطعہ زمین حاصل کیا جو آرنج کے قریب ایک گاؤں سانفیاں میں واقع تھا۔ اس گاؤں کی آبادی کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس ٹکڑے میں ایسی کانٹے دار بوٹیاں اُگ آئی تھیں جو عام طور پر افتادہ زمین میں اُگ جاتی ہیں۔ لیکن یہ خطّہ اس کے چھکیلے دوستوں بھڑوں اور جنگلی شہد کی مکھیوں، متبرک بھونروں اور گورکن کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر کیڑوں مکوڑوں کی اس جنت میں جو اتنی مشقت کے بعد اسے حاصل ہوئی تھی۔ فیبر سے اس دل شکستہ اور مغموم حالت میں آیا کہ اس کی زندگی ناکام ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دن قبل اس کی عزیز از جان بیوی اور چہیتا لڑکا دونوں مر چکے تھے۔ اس کے اپنے الفاظ میں عالم یہ تھا کہ "نہ ماضی کی کوئی حسرت دل میں ہے۔ حتیٰ کہ آغاز شباب کی حسرت بھی نہیں اور نہ ہی مستقبل سے کچھ توقع"۔

رفتہ رفتہ اس کے کارناموں کے چرچے ہر ایک کی زبان پر تھے جس سے عوام میں اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ شہرت نے اب اس منکسرالمزاج مرد ضعیف کے در پہ دستک دی جو ابھی تک کیڑوں کی دنیا میں محو تھا۔ شہرت اپنے جلو میں دولت بھی لیتی آئی کیوں کہ ادب و انشاء کی دنیا کو اب پتہ چلا کہ یہ تو کیڑوں مکوڑوں کا ہومر ہے۔ اس نے زندگی بھر ان دیرینہ لڑائیوں کی داستانیں قلم بند کی تھیں جو ٹرائے کے محاصرے سے بھی زیادہ پُرشکوہ تھیں۔ وہ بالآخر بے سود ثابت نہ ہوئیں۔ بڑے بڑے سائنس دان اب اس کے ہاں حاضری دینے لگے۔ لیکن اس کے ہاں باریابی حاصل کرنا آسان نہ تھا اس لیے کہ یہ مرد ضعیف اپنے کیڑوں کے جلو میں خلوت نشین ہو چکا تھا۔ دنیا میں اس کے لیے محبت و عقیدت کے جو جذبات بتدریج بڑھ رہے تھے۔

وہ بالآخر ۸۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر ایک جشن کی صورت میں ہنری فیبر سے پہنچا ور کیے گئے۔ ۱۹۱۰ء میں اس روز سرنیاں کا چھوٹا سا گاؤں مشاہیر مصنفین، سائنس دانوں، فرینچ اکادمی کے ارکان، جمہوریہ فرانس کے اعلیٰ حکام اور غیر ملکی حکومتوں کے سفیروں کی موجودگی سے جگمگا اٹھا۔ تمغے اور فیتے، القاب اور اعزازات، انعامات اور عطیات کی سرنیاں کے حکیم پر بارش ہوتی اور پہلی دفعہ دنیا کے بڑے آدمیوں نے اس سوونیرز انٹومالوجیکس (SOUVENIRS ENTOMOLOGIQUE) کے مصنف کو دیکھا جس کی دس جلدیں بیک وقت ادب اور سائنس کی ادبیات عالیہ میں شمار کی جاتی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک پیر مرد کو دیکھا جس کا چہرہ خشک جھینگی کی طرح تھا۔ جس میں سے دو سیہ آنکھیں، روشن اور چمکدار دوربین اور زیرک آنکھیں تاباں تھیں۔ دنیا کے دیئے ہوئے اعزازات نے اسے خوش تو کیا لیکن وہ اسے متاثر نہ کر سکے۔ اس کے بعد وہ پانچ سال اور زندہ رہا لیکن اس مدت میں اس نے بہت کم لکھا اور اپنی تجربہ گاہ کے پنجروں پر اس کا کام روز بروز گھٹتا گیا۔ میز کے اطراف فرش پر بچھے ہوئے ٹاٹوں میں مسلسل چلنے اور جبلت، زندگی اور موت کے مسائل پر غور و فکر کے عالم میں چکر کاٹنے کے سبب گڑھا پڑ چکا تھا۔ وہ اب زیادہ تر کرسی کے دستوں پر ہاتھ رکھے خلاء میں انسان کے آخری زوال کی جانب گھورا کرتا تھا۔ کسی شخص نے اس کی عظیم شہرت کو تقدس کا رنگ دینے کی خاطر اس سے پوچھا کہ کیا انہیں خدا کی ذات پر بھی ایمان و اعتقاد ہے۔ "نہیں" اس نے دیرینہ شوخی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا ——— میں اس کو دیکھتا ہوں ہر جگہ اور ہر وقت"۔



پیٹرک ہنری

آتش نوا مقرّر

ہر امریکی ان سات الفاظ سے بخوبی واقف ہوتا ہے جو پیٹرک ہنری کی زبان سے نکلے تھے۔ لیکن بہت کم لوگ آپ کو یہ بتا سکیں گے کہ اس نے امریکیوں کو آزادی دلانے کے لیے کیا کیا۔ تاہم ان تمام محبانِ وطن میں جنھوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ ہنری کی مثال میر کارواں کی سی ہے۔ اس کی طرح کسی اور امریکی کی، اس کی زندگی میں جنون کی حد تک پرستش نہیں کی گئی تھی اور اس کے سوا کبھی کسی شخص کو امر بننے کی اتنی سہولتیں بھی فراہم نہ ہوئی ہوں گی لیکن اس کی طرح شاید ہی کسی اور نے اتنا خوف زدہ ہو کر حذر کیا ہو۔ ہنری کے نزدیک امر بننے کے مقابلہ میں مرجانا کہیں بہتر تھا۔

پیٹرک ہنری کو آپ کی اور میری آزادی اتنی ہی عزیز تھی جتنی اس کو خود اپنی آزادی عزیز تھی۔ اس نے اور محبانِ وطن کی طرح اپنی زندگی بھی

نوآبادیوں کے باشندوں کے لیے انگریزوں کے مساوی حقوق کے مطالبے سے آغاز کی۔ بہت سے لوگ شاید اس پہ قانع ہو جاتے کہ امریکہ امن کے ساتھ برطانیہ کے تابع رہے۔ لیکن ہنری یقیناً اس پر قانع نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سرتاپا امریکی تھا۔ ۱۷۳۶ء میں وہ ورجینیا میں پیدا ہوا۔ سمندر اور برطانیہ کی جانب ہمیشہ اس کی پیٹھ ہی رہی، اور اس کا رخ نئی سرحدوں اور مستقبل کی جانب تھا۔ وہ ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اور اس وقت بلوغت کو پہنچا جب امریکہ بھی ایک قوم کی حیثیت سے عالم شباب میں قدم رکھ چکا تھا۔

اس میں کسی خاندانی انگریز کی خصوصیات کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ "خانہ ساز" تھا اور اس بات کا قائل تھا کہ ہر شخص اپنی زندگی آپ بنائے۔ اس لیے کہ وہ خود اپنی زندگی کا معمار تھا۔ اس کا نام امریکی لیڈروں میں سرفہرست تھا تاہم وہ عالی نسب، انتہائی آزاد خیال اور وسیع المشرب سکاچ، آئرش نسل سے تعلق رکھتا تھا۔

دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح وہ بھی ہر اس کام میں ناکام رہا جس میں اس نے ہاتھ ڈالا۔ تاآنکہ اس کی صلاحیتوں کا رخ متعین ہو گیا۔ اس نے دوکان لگائی لیکن وہ چلی نہیں۔ محبت کے معاملے میں وہ البتہ خوش نصیب رہا۔ اور اس نے اٹھارہ سال کے سن میں ایک ایسی دلہن سے شادی کی جو جہیز میں تھوڑی سی زمین بھی لے آئی۔ لیکن کھیتی باڑی میں قسمت نے یاوری نہ کی تو اس نے پھر سے دوکان کھولی اور اس میں دوبارہ ناکام ہوا۔ تیئیس برس کی عمر میں وہ چار بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ قرضوں کا پہاڑ اس کے سر پہ تھا۔ ہنر اس نے کوئی

سیکھا نہ تھا ہاں دوستوں کا جمِ غفیر اس کے گرد ضرور رہتا تھا۔

وہ تیز حافظے، منطقی دماغ، بذلہ سنج طبیعت اور ٹھنڈے مزاج کا مالک تھا۔ بحث کے وقت وہ اپنی بات پر اڑ جاتا تھا۔ لیکن مخاطبت میں اول گفتگو ملحوظ رکھتا تھا۔ دوسرے فطیبوں کے برخلاف وہ یہ جانتا تھا کہ عام آدمی کس انداز میں اور کیا سوچتا ہے۔ چنانچہ عام آدمی بھی اس کی سیدھی سادی گفتگو سمجھ سکتے تھے اور وہ انہیں اسی طرح جوش میں لا سکتا تھا۔ جیسے ہوائیں سمندر میں تلاطم پیدا کرتی ہیں۔

یہ تمام اوصاف آخر کس زندگی کی نشاندہی کر رہے تھے؟ اس کا جواب اس غریب نوجوان کے قلب و دماغ پر برق کی طرح کوند گیا۔ لیکن فرصت اور پیسے کے بغیر وہ قانون کی تعلیم کیسے حاصل کر سکتا تھا؟ اس نے ایک معیاری کتاب اور "ورجینیا کے قوانین" کسی سے مستعار لی۔ چھ ہفتوں میں اس نے اس کتاب کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اس کے بعد دیہاتیوں کے سے بھدے اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ ورجینیا، کے دار الحکومت ولیمز برگ میں قانون کے خصوصی ممتحنوں کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے بہت جلد اس کا پتہ لگا لیا کہ اس کا علم قانون کتنا محدود تھا۔ تاہم جہاں تک بنیادی انصاف کا تعلق تھا اس کی فہم بے خطا تھی۔ اس کا استدلال غیر متزلزل تھا۔ گویا وہ ایک پیدائشی قانون داں تھا گو اس کا مطالعہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ بالآخر کسی رد و قدح کے بعد ان ماہرین قانون نے اس کی درخواست پر دستخط کر دیئے۔

وکالت کرنے کے لیے وہ اپنے آبائی قصبہ میں لوٹ آیا۔ یہاں اس نے قانون کا گہرا مطالعہ بھی شروع کیا اور تین سال میں ۱۱۸۵ مقدموں کی پیروی کی۔ ان میں سے بیشتر میں اس نے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد پادریوں کا مشہور مقدمہ شروع ہوا جو چرچ آف انگلینڈ سے متعلق ورجینیا میں اپنی فضول خرچی، غیر دینی حرکات اور اپنی بٹائی وصول کرنے میں لالچ کی وجہ سے بدنام تھے۔ وہ لوگ یہ بٹائی عام طور پر تمباکو کی صورت میں وصول کرتے تھے اور اب یہ چاہتے تھے کہ بٹائی کی شرح تمباکو کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے تناسب سے مقرر کی جائے۔ دوسرے الفاظ میں وہ سٹّہ کھیل رہے تھے۔ ہینوور کورٹ ہاؤس میں مقدمہ چلایا گیا۔ جج جو نوجوان پیٹرک کا باپ تھا، ان پادریوں کے حق میں فیصلہ صادر کر چکا تھا۔ جب ہنری نے فریق ثانی کی جانب سے یہ کمزور مقدمہ اپنے ہاتھ میں لیا تو جیوری اس وقت صرف اتنا کر سکتی تھی کہ کلیسا کو واجب الادا رقم کا تعین کرتی چنانچہ بڑے اطمینان کے ساتھ جیوری کے ارکان محض تفریح و تماشے کی خاطر عدالت کے کمرے میں جمع ہوئے لیکن گھنٹہ بھر بعد وہ اس عالم میں کمرہ عدالت سے باہر نکلے کہ ان کے کان گونج رہے تھے، اور چہرے تمتما رہے تھے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے وقت اور ملک کے سب سے بڑے وکیل نے ان کی گویا چمڑی ادھیڑ دی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے کلیسائی قوانین کی مذمت کی، اور عدالت حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ اس نے بلند آواز سے چیخ چیخ کر کہا کہ یہ قوانین ورجینیا کے آزاد باشندوں کے حقوق پر تاج برطانیہ کی دست اندازی ہیں۔ جیوری نے مدعی کے حق میں صرف ایک پینی کا فیصلہ صادر کیا۔

اور عوام ہنری کو عدالت سے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر لے گئے۔ اگلے سال ہنری ورجینیا کی صوبائی مجلس قانون ساز کے ایوان زیریں کا رُکن منتخب ہوا۔ اسے اپنی نشست سنبھالے بمشکل نو دن ہوئے تھے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ اسٹیمپ ایکٹ کی نقول پہنچیں۔ اس قانون کی رو سے نو آبادیوں کے تمام قانونی دستاویزات اور اخبارات، کتابچوں اور جنتریوں، ان سب پر ایک گراں قیمت کا ٹکٹ چسپاں کرنے کی پابندی عائد کی گئی تھی تاکہ سرخ ہندیوں کی سرحدوں کے تحفظ کے گراں اخراجات کی پابجائی کے لیے رقم جمع کی جا سکے۔ اس پر ہنری نے نعرہ بلند کیا کہ آزاد افراد پر ان کی مرضی کے بغیر محصول عائد کرنا میگنا کارٹا (منشور اعظم) کے اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ہنری نے یکے بعد دیگرے جوشیلی قراردادوں کے ذریعہ یہ اصرار کیا کہ آزاد عوام پر ایسے قوانین کے ذریعہ حکومت نہیں کی جا سکتی جو انھوں نے خود نہ بنائے ہوں۔ اور اس نے کہا کہ ورجینیا کی مقننہ پارلیمان اور تاج کی تابع نہیں۔

نوجوان تھامس جیفرسن، ایوان کے دروازے سے ٹیک لگائے دندناتی ہوئی منطق سے مسحور ہو کر ہنری کی خطابت کے خون گرما دینے والے طبل کی آواز سن رہا تھا۔ ایک خاموش اور متین مندوب جارج واشنگٹن بھی اجلاس میں شریک تھا۔ اس کا یہ دعویٰ مشہور تھا کہ کوئی شخص اسے "خود مختاری" جیسی بے تکی باتیں کرتا کبھی نہ پائے گا لیکن پیٹرک ہنری کی زبان سے یہ فقرے نکلنے پر وہ بھی کان لگا کر اس کی باتیں سننے لگا۔

"سیزر کے لیے بروٹس پیدا ہوا تھا۔ چارلس اوّل کے لیے

کرامول پیدا ہوا، اور جارج سوم کے لیے........ یہاں پہنچ کر ہنری خاموش ہو گیا کیوں کہ یہ نوجوان وقفوں کے ذریعے اظہارِ مطلب کے فن کا ماہر تھا اور اس وقفے میں ایوان کے کئی گوشوں سے "غداری، غداری" کی آواز بلند ہوئی۔ لیکن ہنری نے کمال چالاکی کے ساتھ یہ جملہ یوں پورا کیا، "یہ مناسب ہے کہ وہ ان لوگوں کے حشر سے سبق حاصل کرے، اور پھر اس نے آخری تیر چھوڑا،" اب اگر یہ غداری ہے تو دل کی ہوس پوری کر لو۔" بہر حال بڑی ہنگامہ آرائی کے بعد ایوان نے ہنری کی قرار دادیں منظور کر لیں۔ دوسرے ہی دن شاہی گورنر نے ایوان کی کارروائی سے یہ قرار دادیں حذف کرا دیں لیکن اس وقت تک ان کی نقول چارلسٹن سے بوسٹن تک تمام محبانِ وطن تک پہنچ چکی تھیں۔ خفیہ طور پر یہ قرار دادیں ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی رہیں —— یہ قرار دادیں چنگاریوں کی طرح اُڑیں اور انھوں نے چاروں طرف اُمید کے شعلے بھڑکا دیئے۔ ادھر برطانیہ نے ڈر کے مارے اسٹیمپ ایکٹ کو منسوخ کر دیا۔

مجلس قانون ساز کے اگلے اجلاس میں بھی ہنری موجود تھا۔ اور وہ شاہی گورنر سے کہیں زیادہ مقننہ پر حاوی رہا۔ اس نے ہر آئینی کشمکش کی قیادت کی اور ان میں سب سے زیادہ تلخ کش مکش قابلِ نفرین ٹاؤنسینڈ قوانین کے بارے میں ہوئی۔ ان میں سے پہلے قانون نے نیو یارک کی صوبائی مجلس قانون ساز کو اس خطا کی پاداش میں معطل کر دیا تھا کہ وہ پڑاؤ کے اس قانون کی تعمیل نہ کر سکی جس کی رُو سے برطانوی فوجی دستوں کے اخراجات کی

ذمہ داری نوآبادیات پر ہی ڈالی گئی تھی۔ دوسرے اور تیسرے ٹاؤن سینڈ ایکٹ کی رُو سے ایک درآمدی محصول کے ذریعہ مالیہ میں اضافہ کیا گیا تھا، اور یہ محصول نوآبادیات کی منظوری کے بغیر شیشہ، کاغذ، روغن اور چائے کی درآمد پر لگایا گیا تھا۔ انگلستان تک میں پٹ اور برک نے اس ناانصافی کی مذمت کی تھی اور ورجینیا میں ہنری اور اس کے حامی اس پر اتنے مشتعل اور برافروختہ تھے کہ گورنر نے خوف زدہ ہو کر مجلس قانون سازی کو برطرف کر دیا۔

اس پر مجلس قانون ساز کے آزاد خیال ارکان جنہیں قدامت پسند پارٹی "خودسر" اور خطرناک نوجوان باغیوں کے نام سے پکارتی تھی میدانِ عمل میں کود پڑے۔ یہ لوگ ولیمز برگ کی پُرسکون، خوابیدہ، پُرشکوہ راہوں سے گزرتے ہوئے ریلے کے شراب خانے میں پہنچے۔ جام طلب کیے دروازے کو قفل چڑھایا اور ایک ایسا اجلاس شروع کیا جو جتنا غیر قانونی تھا اتنا ہی عہد آفریں بھی ثابت ہوا۔ اس شراب خانے کے دل کش "اپولوروم" میں نوعمر جیفرسن، رچرڈ ہنری لی، فرانسس لائٹ فٹ لی، ڈیبنی کار، پیٹن رینڈالف، جارج میسن نے ہنری کے جام سے جام ٹکرا کر ایک نئی اور آزاد قوم کے نام پر پیمانِ وفا باندھا۔ یہ الفاظ بڑے ہی خطرناک تھے جو بند دروازے کے پیچھے ہی زبان سے ادا کیے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ الفاظ جری بھی تھے۔ ایک نئے پرچم کی طرح بلند ہو کر ہواؤں کے دوش پر فضائے عالم میں پھیل گئے کیونکہ آزاد خیال ارکان اسمبلی ایک باعزت مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی

پیٹرک ہنری کی مانند دوربین نہ تھا۔ جیفرسن لکھتا ہے کہ" ہم میں جو اتفاق رائے و اتحادِ فکر کارفرما تھا۔ اس کے لیے ہم ہنری کے مرہون منت ہیں"۔

نو آبادیات کو اس اتحاد کی شدید ضرورت تھی۔ اپنی اپنی جگہ تو وہ سب سرکش تھیں لیکن برطانیہ کے مقابلے کی کسی میں سکت نہ تھی۔ اگر یہ متحدہ اقدام کرتیں تو اس کا امکان تھا کہ پارلیمنٹ اور بادشاہ خوف زدہ ہو کر زیادہ معقول طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے چنانچہ انھوں نے ایک برِاعظمی کانفرنس ۱۷۷۴ء فلاڈلفیا میں طلب کی۔ اکثر آزاد خیال بشمول ہنری اس کانفرنس کے مندوب تھے تو جارج واشنگٹن جیسے قدامت پسند رکن نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس تاریخی اور یادگار چھوٹی عمارت میں جو بعد ازاں ایوان حریت سے موسوم ہوئی۔ یہ لوگ نیو انگلینڈ کے محبان وطن کے ساتھ جمع ہوئے۔ جان ایڈمز نے اس واقعہ کے بارے میں اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔" لیکن ورجینیا کے یہ حضرات سب سے بڑھ کر پُرجوش اور مستقل مزاج تھے"۔ بعد ازاں اس نے یہ اضافہ کیا ہے۔" پیٹرک ہنری کے سوا میں نے کسی رکن میں بھی یہ احساس نہ پایا کہ وہ ایک بلند چٹان کے سرے یا یوں کہیے کہ چوٹی پر کھڑے ہوتے ہیں اور کسی میں اتنی صاف گوئی اور جرأت بھی نہ تھی کہ وہ حالات کی اس نزاکت کا اعتراف کرتا۔

پیٹرک ہنری نے تمام مندوبین سے اس التجا کے ساتھ کانگریس کا افتتاح کیا کہ وہ یہ بات بھول جائیں کہ وہ مختلف گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہر قرارداد پر محبان وطن کی حیثیت سے رائے دیں۔ اس نے نعرہ لگایا، یارو! میں ورجینیائی نہیں بلکہ امریکی ہوں، ———— پہلی برِاعظمی

کانگریس نے اپنے اختتام پر برطانیہ کی خدمت میں ایک ایسا محضر پیش کیا جس کی بابت لارڈ چیتھم نے دارالامرا میں بیان دیا کہ اس محضر کا ٹھوس استدلال اور اس کے دلائل کی معقولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے لوگوں پر حکومت ٹھونسنے کی کوششیں مہلک ثابت ہوں گی۔ بہت سے مندوبین بھی اپنے کام سے مطمئن ہو کر گھر لوٹ گئے لیکن ہنری کا یہ خیال تھا کہ برطانیہ اس محضر کی پروا نہیں کرے گا۔ اور نو آبادیوں کو لڑنا ہی پڑے گا۔

چند دنوں بعد ہی برطانوی فوجی دستوں اور بوسٹن کے ہجوموں کے درمیان جو تصادم ہوئے اور جارج سوم نے نو آبادیات کی بیرونی تجارت کو کچل دینے کے عزائم کا جو اعلان کیا اس نے ہنری کے خیال کو درست ثابت کیا اس نے ورجینیا کی ملیشیا کو طلب کیا اور آنے والی جدوجہد کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے مسلح ہو جانے کی ہدایت کی چنانچہ دارالعوام میں جب ایک مسودہ قانون پیش ہوا جس کی رو سے تمام تائب باغیوں کو معافی دی گئی تھی تو پیٹرک ہنری کی بابت یہ استثنیٰ رکھا گیا کہ اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔

۱۷۷۵ء میں ماہ مارچ کے ایک دن ورجینیا کنونشن کا ایک اجلاس شاہی گورنر، برطانوی جنگی جہازوں اور ولیمز برگ کے جذباتی ٹوریوں کے اثر سے دُور رہنے کی خاطر رچمنڈ میں شروع ہوا۔ اس وقت رچمنڈ ایک ناپختہ اور نیا نیا قصبہ تھا اور اس قصبہ میں سب سے بڑا مقام جہاں مندوبین جمع ہو سکتے تھے۔ سینٹ جان کا گرجا تھا۔ ہمیں آج یہ گرجا بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ اور جب پیٹرک ہنری اس میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو یہ اور بھی چھوٹا تھا۔

گرجا میں یقیناً سردی ہوگی اور اگر آپ ہنری کی عظیم تقریر کی سالگرہ کے موقع پر وہاں جائیں تو آج بھی آپ سردی محسوس کریں گے۔ اس وقت بھی اس گرجا میں امید و بیم کی فضا میں ویسا ہی سکوت طاری ہوگا جس طرح آج اس عمارت میں معبد کی خموشی کی وجہ سے سکوت رہتا ہے۔ ملک کے سامنے جنگ یا امن میں سے کسی ایک کے انتخاب کا سوال تھا۔ اگر ملک کو جنگ کا انتخاب کرنا پڑتا تو گویا اسے تربیت یافتہ اور تجربہ کار فوجی دستوں کا مقابلہ کرنا پڑتا اور اس وقت کی سب سے بڑی بحری طاقت کا سامنا کرنے کے لیے ماہی گیر کشتیوں کے سوا کوئی سامان ان کے پاس نہ تھا۔ اور اگر یہ مندوبین امن کا انتخاب کرتے تو ان کی دولت اور املاک، اور ان کی گردنیں محفوظ رہتیں۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ اس روز بہت سے لوگ مذبذب اور محتاط نظر آتے تھے۔ اور جب پیٹرک ہنری تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو وہ بھی اپنے بارے میں زیادہ پُر یقین معلوم نہ ہوتا تھا۔

لیکن یہ ہنری کی ایک دیرینہ چال تھی۔ وہ اپنی تقریر ہمیشہ رُک رُک اور جھجک جھجک کر اور بڑی پست آواز میں شروع کرتا تھا۔ جیسے اسے خود اپنی رائے کے بارے میں اطمینان نہیں ہے۔ لیکن بتدریج وہ آواز بڑھاتا گیا تاآنکہ کلیسا کی چوبی دیواریں اس کی آواز سے گونجنے لگیں اس نے کہا "لوگ خواہ کتنا ہی امن! امن!! کا نعرہ لگائیں لیکن اب امن کا دور نہیں رہا۔ کیا زندگی اتنی عزیز یا امن اتنا شیریں ہے کہ اسے غلامی کے طوق کے عوض خریدا جائے۔"

جب سکول کے طالب علم کی حیثیت سے ہم نے اس لافانی

تقریر کو اپنے معصوم بچپن کے زمانے میں پڑھا تھا تو طوق اور غلامی صرف الفاظ معلوم ہوتے تھے لیکن حال ہی میں ان کا ایسے پیمانے پر احیاء عمل میں آیا ہے۔ جو خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اور میری اور آپ کی طرح کے مرد اور عورتیں ان کے بوجھ تلے کراہتے رہے ہیں۔ طوقِ غلامی کی زد میں آیا ہوا کوئی شخص ایسا نہیں جو ہنری پیٹرک کی طرح یہ نعرہ نہ لگائے۔

"خدائے لازوال الحذر! میں نہیں جانتا کہ دوسرے کیا طریقِ کار پسند کریں گے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے آزادی دے ۔۔۔۔ یا موت!" پیٹرک ہنری کے ان الفاظ کے زیر اثر سرگرم عمل ہو کر کنونشن نے توپ خانوں اور رسالوں اور پیادوں کی تربیت کی منظوری دی۔ خبر آئی کہ شاہی گورنر ڈنمور نے ولیمز برگ میں نوآبادی کے بارود خانے پر قبضہ کر لیا۔ اس پر پیٹرک ہنری نے قصبے کی ایک ملیشیا کو انگیخت کیا اور اسے لے کر دارالحکومت کی طرف چڑھائی کر دی۔ گورنر ڈنمور ڈر کے مارے بھاگ کر ایک جنگی جہاز میں جا چھپا اور بارود کی قیمت بھجوا دی۔ دوسرے دن اس نے پیٹرک ہنری نامی ایک شخص کو "باغی" قرار دے دیا۔

لیکن یہ باغی اس دوسری برّاعظمی کانگریس میں شرکت کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ جس میں جارج واشنگٹن کو سپہ سالار افواج منتخب کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد اپنی جاں بہ لب بیوی کی بالیں سے اٹھ کر ہنری نے ملیشیا کے کرنل کی حیثیت سے ان ریاستی افواج کا چارج لیا جو ولیم اینڈ میری کالج کے درختوں کے زیر سایہ پڑی ہوئی تھیں۔ پیٹرک ہنری محض خطیب نہیں تھا جو

دوسروں کو جنگ پر ابھارتا۔ وہ خود بھی جنگ لڑنے پر آمادہ تھا۔ اسی وجہ سے جب کمان میں دوسرے افسروں کو اس پر ترجیح دی گئی تو اسے صدمہ پہنچا، اور ملیشیا جو اس کے گن گاتی تھی۔ وہ بھی اس کی خاطر نئے افسروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کو تیار تھی۔ لیکن ہنری نے اسے دلاسہ دیا۔ اس کے بعد جیسا کہ اس کے دوست توقع کر رہے تھے۔ وہ مستعفی ہو گیا۔ اس لیے کہ فوج سے زیادہ شہری زندگی کو اس کی ضرورت تھی چنانچہ وہ جلد ہی ورجینیا کے لیے دستور کی تدوین کے کام میں سرگرمی سے مصروف ہو گیا۔ اور فوراً ہی اس کا گورنر منتخب کیا گیا۔

ہنری اگرچہ سپاہی نہ تھا لیکن یہ اسی کی تجویز تھی کہ جارج راجرز کلارک کو پہاڑوں سے پرے ایک خفیہ مشن پر روانہ کیا جائے۔ اس مہم کی بدولت وسطی مغرب کا علاقہ ریاست ہائے متحدہ کے لیے محفوظ رہا۔ وہ چاہے ڈپلومیٹ نہ تھا۔ لیکن یہ ہنری ہی تھا جس نے حاسد افسروں کی اس سازش کو بے نقاب کیا کہ وہ واشنگٹن کو نکال باہر کرنا چاہتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ محبِ وطن اور ایک دیانت دار محب وطن تھا۔ کیوں کہ جدوجہد کے سات ہولناک برسوں کے بعد جب فتح حاصل ہوئی تو مابعد جنگ امریکہ کے مسائل بڑے لرزہ خیز تھے، ملک قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ جب پیٹرک ہنری نے نعرۂ جنگ کو عام کیا تھا۔ جنگ کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے بہت سے مخالف اسباب تھے۔ بہت کم افراد کو اور ریاستوں کو جنگ کے اخراجات کی ادائیگی کی فکر تھی۔ کسی سیاست دان کے لیے یہ اقدام خودکشی سے کم

نہ تھا کہ وہ پبلک سے کیے گئے وعدے کو ایفا کرنے کی تجویز پیش کرے اور جن فوجی سپاہیوں کو تنخواہ ادا نہیں ہوئی تھی۔ ان کے بقایا جات ادا کرائے۔ تاہم ہنری نے ورجینیا کو اس پر مجبور کیا کہ وہ محاصل کا اس سے کہیں زیادہ بوجھ برداشت کرے جتنا محصول برطانیہ نے شاید ہی کبھی عائد کیا ہو۔ اس کے باوجود پانچ بار ورجینیا کا گورنر منتخب ہوا۔ لیکن اس مرحلہ پر یہ شخص جس کی عظمت امریکی تاریخ سے وابستہ ہو چکی تھی۔ جس کی حب الوطنی اور دیانت داری شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ اپنے عقائد سے مغلوب ہو کر ایک ایسی نئی راہ پر گامزن ہو گیا۔ جس کی دوسرے اچھے امریکیوں نے بھی تقلید کی ——— یعنی الگ تھلگ رہنے کا راستہ۔ جب ریاستوں کی کمزور کانفیڈریشن کی بجائے ایک یونین تشکیل دینے کے لیے دستوری کنونشن طلب کیا گیا تو ہنری نے اس میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ مزید برآں جب ۱۷۸۷ء میں دستور تشکیل دیا گیا اور توثیق کے لیے ریاستوں کو بھیجا گیا تو پیٹرک ہنری نے اپنے تمام وقار اور اثر کو داؤں پر لگا کر ورجینیا کی اسمبلی میں اس کی شدید مخالفت کی۔ تیس دن وہ اس کی مخالفت میں بولتا رہا اور بعض دفعہ تو وہ دن میں پانچ بار تقریر کیا کرتا تھا۔ کیوں کہ اسے خطرہ تھا کہ مضبوط مرکزی حکومت کا قیام ریاستوں کے حقوق اور انفرادی آزادی کے حق میں پیام مرگ ثابت ہو گا۔

تاہم جب ورجینیا اور دوسری ریاستوں نے دستور کی توثیق کر دی تو ہنری نے بڑی جرأت سے اس کی قبولیت اور اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کیا لیکن وفاقی حکومت کے بارے میں اس کے خدشات

بدستور قائم رہے۔ وہ اس کی مخالفتوں کا اسی طرح مرکز بن گیا۔ جس طرح واشنگٹن وفاقی استحکام کا ستون بنا ہوا تھا۔ ہنری نے نئی حکومت کے تحت ایک دن بھی کام کرنا گوارا نہ کیا۔ حالانکہ صدر واشنگٹن نے اسے وزارت خارجہ اور چیف جسٹس کے عہدے پیش کیے۔ یا اگر وہ خواہش ظاہر کرتا تو فرانس میں سفیر بھی بن سکتا تھا۔

لیکن پیٹرک ہنری اب بھی افراد کی آزادیوں کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ اسے بھی جیفرسن، جارج میسن اور دوسروں کی طرح دستور میں بڑا رخنہ نظر آیا، اور اس نے خبردار کیا کہ اس شگاف سے وہ اصول بہے جا رہے ہیں جن کی خاطر انقلابی سپاہی نے جنگ کی، اور اپنی جان دی تھی، یعنی آزادیٔ تقریر و اجتماع، کسی مقدمہ کے بغیر نظر بندی سے آزادی، اسلحہ رکھنے، جیوری کے ذریعہ مقدمہ کا فیصلہ کرانے حکومت اور افسروں پر تنقید کرنے کا حق، اور اپنے ضمیر کی ہدایت کے مطابق مذہب پر چلنے کی آزادی۔

اگر کوئی مرکزی حکومت مطلق العنانی سے کام لے کر کسی دن افراد کے حقوق پر چھاپہ مارے تو "قانون حقوق" کے بغیر عوام کے پاس احتساب کا کوئی سامان نہ ہوتا۔

اس موضوع پر ہنری لگاتار اظہارِ خیال کرتا رہا اور اسے ہمیشہ ہی سامعین میسر آتے۔ حتیٰ کہ رائے عامہ کے دباؤ کے تحت دستور میں پہلے دس ترامیم کرنی پڑیں۔ جب کبھی کوئی عام امریکی اپنے دستور کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتا ہے تو دراصل اس کے پیش نظر یہی "قانون حقوق" ہوتا ہے

اور گو پیٹرک ہنری نے اس قانون کو اس طرح تحریر نہیں کیا جس طرح یہ دستور میں موجود ہے کیوں کہ وہ کانگریس میں نہ تھا تاہم امریکہ کے شہری اپنی انفرادی آزادیوں کے قانونی تحفظ کے لیے اسی کی بے خواب خبرگیری اور نگرانی کے مرہونِ منت ہیں۔

ساٹھ سال سے کم ہونے کے باوجود مسلسل تیس سال کی محنت شاقہ کی وجہ سے ہنری اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر آرام سے دیہی زندگی کا لطف اٹھائے۔ اس میں شک نہیں، وہ جیفرسن کی دوستی سے محروم ہو چکا تھا اور واشنگٹن کا مخالف بن گیا تھا تاہم عوام میں اسے ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ لیکن قیادت سے تھک کر وہ ورجینیا کی دِل کش سرخ پہاڑیوں میں "ریڈہل" کے مقام پر گوشہ نشین ہو گیا جہاں بڑے بڑے سبزہ زار تھے اور اس کے پوتے ان سبزہ زاروں پر کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔

اسی دَور کا ایک اور شخص بھی جو پیٹرک ہنری سے زیادہ معمّر اور عظیم تھا، اپنے کھیتوں اور بال بچوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزارنے کے لیے گوشہ نشین ہو گیا تھا اور یہ خیال ہی اس کی طمانیت قلب کے لیے کافی تھا کہ اس سے زیادہ کسی نے وطن کی خدمت نہیں کی۔ لیکن وہ آرام نہ کر سکا کیوں کہ عدم اتحاد کے سبب اسے مُلک پارہ پارہ نظر آ رہا تھا۔ ایک پارٹی، انگلستان سے جنگ کا مطالبہ کر رہی تھی، تو دوسری جماعت فرانس کے خلاف جنگ کا نعرہ لگا رہی تھی۔ فرانسیسی حکومت اس وقت اپنے انقلابی جنون کی

انتہا پر تھی اور اس کے ایجنٹ امریکی عوام سے براہ راست یہ اپیل کر رہے تھے کہ وہ یورپی تصادم میں شامل ہو جائیں ۔ ریاستی حقوق کے علمبرداروں نے اس نوعیت کی قرار دادیں منظور کرا لی تھیں کہ کسی ریاست کو بھی وفاقی حکومت کے اقدامات کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے ۔ وفاقی انتخابات اور ریاستی انتخابات دونوں ہی قریب آ رہے تھے اور یہ نو آزاد ملک جو اب بھی متحد سے زیادہ مرکز گریز تھا اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا ۔ بددلی کا مرکز ورجینیا میں تھا جو اس متزلزل یونین کی کلیدی ریاست تھی ۔ جس پہ خطرہ لاحق تھا ۔ اور ورجینیا کا رخ ہمیشہ وہی ہوتا تھا جو پیٹرک ہنری کا رخ ہوتا تھا ۔ چنانچہ ماؤنٹ ورنن کے مالک نے قلم اٹھا کر اتنا ہیجر سے صفحات سیہ کرنے شروع کیے ۔

"....اس بحران کی حالت میں جب کہ یہ پارٹی حکومت کے ہر اس اقدام کی مخالفت کر رہی ہے جس کا مقصد ملک کا تحفظ ہے جبکہ منظم طور پر مسلسل ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جو بالآخر یونین کی تباہی پہ منتج ہوں گے ۔ کیا ایسی شخصیتوں کو جو اپنے ملک کی رستگاری کر سکتی ہیں ، یہ زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے گھر بیٹھے رہیں ؟ مجھے امید ہے کہ آپ ہونے والے انتخابات کے موقع پہ آگے بڑھیں گے ۔ ایوان نمائندگان میں آپ کا کردار اور اثر و رسوخ ان خطرناک جذبات کے خلاف مورچے کا کام دے گا جس کا اس وقت وہاں اظہار ہو رہا ہے ۔ میری رائے میں اس بحران کے وقت آپ کی موجودگی ضروری ہے ۔

آپ کا تابعدار اور خاکسار

جارج واشنگٹن

اور پیٹرک ہنری نے مکتوب کے صفحہ پر سے اس انداز سے نظریں اٹھائیں جیسے جنگ کی آواز اس کے کان میں پڑی ہو۔ نعرہ یونین کے استحکام کے لیے تھا، اور جس طرح وہ تمام لوگ جو کسی زمانے میں علیٰحدگی پسندی کے حق میں تھے یہ دیکھ چکے ہیں کہ قیام امن کی خاطر اقوام کو لازماً متحد ہو جانا چاہیے، اسی طرح ہنری یہ جانتا تھا کہ ریاست یا فرد کا حق امریکہ کے غیر منقسم وجود سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتا۔

یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ امریکی سینٹ کے لیے وفاقی امیدوار جان مارشل کی حمایت کرے گا، پیٹرک ہنری ورجینیا کی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے لیے کھڑا ہو گیا۔ بیمار اور ناتواں ہونے کے باوجود اس نے تقریر کے لیے شارلٹن بیس میل کا سفر کیا۔ اس خبر نے ریاست میں جوش و خروش کی لہر دوڑا دی کہ پیٹرک دوبارہ میدان میں آ گیا ہے۔ جب وہ سرائے سے باہر نکلا تو چاروں طرف سے ہجوم اس سے ملاقات کی غرض سے منتظر تھا۔ عمر کے بوجھ سے وہ خمیدہ ہو چکا تھا۔ اس کا متفکّر چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق رُک رُک کر بولنا شروع کیا۔ کیوں کہ اسے اپنے آپ خود اپنے کیے پر پانی پھیرنا تھا۔ جب یونین کی اس نے یہ کہہ کر مذمّت کی تھی کہ آزادی کے حق میں یہ خطرات سے پُر ہے اب اسی یونین کو بچانا ضروری تھا کہ مبادا عدم اتحاد اور بیرونی مداخلت ساری آزادیاں چھین لے۔ لیکن جب وہ ایک معمّر سپاہی کی طرح اپنے خمیدہ جسم کو تان کر کھڑا ہوا تو وہ ہمیشہ سے زیادہ سر بلند نظر آ رہا تھا۔ اس کی آواز شمشیر

بے نیام کی طرح دمک رہی تھی۔ اس نے خبردار کیا کہ کسی ریاست کو وفاقی قوانین کے جواز پر حرف رکھنے کا حق نہیں۔ کوئی جزو کل سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔

"مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ جب لوگوں پر ظلم ناقابل برداشت ہو جائے تو کیا کیا جائے، میرا جواب ہے، حکومت کا تختہ اُلٹ دو۔ لیکن اس وقت تک نہیں جب تک کہ آپ کے حقوق میں کوئی ایسی دخل اندازی نہ ہو، جس کی تلافی کے لیے آپ دوسرا راستہ اختیار نہ کر سکیں۔ اس لیے کہ اگر آپ نے ایک اور انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تو ——— آپ ہمیشہ کے لیے نمائندہ حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

جب اس نے تقریر ختم کی تو وہ پُرجوش مجمع کی آغوش میں گر پڑا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اسے اٹھا کر سرائے میں ایک چارپائی تک پہنچایا گیا۔ ایک مشہور استاد نے جو اس وقت اس کے پاس کھڑا تھا، تبصرہ کرتے ہوئے کہا ——— "سورج پوری آب و تاب کے ساتھ غروب ہو گیا ہے۔"

اگلے مہینے ہنری بھی منتخب ہو گیا اور مارشل بھی۔ لیکن مجلس قانون ساز کے اجلاس ہی سے قبل بے داغ شمشیر کا مالک جارج واشنگٹن، اور شمشیر زباں پیٹرک دونوں ہی چل بسے ؎

شاہین کتب

وداعِ جنگ (دو جلد) — مترجم اشفاق احمد — ۱/- فی جلد

ERNEST HEMINGWAY — A FARE WELL TO ARMS

سُرخ تمغہ — ،، اِنتظار حسین — ۱/۸/- فی جلد

STEPHEN CRANE — RED BADGE OF COURAGE

ابراہام لِنکن — ،، محمد بدر السّلام فاضلی — ۱/۸/- فی جلد

EMIL LUDWIG — ABRAHAM LINCOLN

دُلہن — ،، جاوید صدیقی — ۱/۸/- فی جلد

STEPHEN CRANE — BRIDE COMES TO YELLOW SKY

تھامس الوا ایڈیسن — ،، مکین احسن کلیم — ۱/۸/- فی جلد

G. GLENWOOD CLARK — T. A. EDISON

یونائیٹڈ بک ڈپو لمیٹڈ۔ لاہو